اُردو مرکز لائبریری

پیامِ زندگی

جلدِ نہم

مرتبہ اُردو مرکز لاہور

پبلشر عطرچند کپور اینڈ سنز پبلشرز انارکلی لاہور

نذیر احمد

معرفت ایل۔اے۔او ایئر فورس

پشاور چھاونی

ملک مولا بخش محمد شریف سلطان پوری

محمود آباد ڈاک اوکاڑہ ضلع منٹگمری ٹیلیفون ع ۲۳

محمد حسین مکان ع ۳۸ کوچہ شبو رام

تھانہ روڈ پشاور چھاونی

اُردو مرکز لائبریری

اُردو ادب کے جاں فروز مرثیوں کا علمی انتخاب

پیامِ زندگی

جلد نہم

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
(اقبال)

مُرتّبہ

لینا تاجورؔ نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحادؔ

بہ اعانتِ

حضرات اراکین اُردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز لاہور

اُردو مرکز لاہور

ملک کی واحد اکیڈمی (اُردو مرکز لاہور) انتخاب ہفت کشور پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے +

(۱) اُردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اُس جاندار اور مفید حصّے کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے - حتّے الامکان تاریخی ترتیب کے ساتھ مجلّدات میں شائع کرنا +

(۲) اُردو زبان کی مکمّل انسائیکلو پیڈیا کی تالیف +

(۳) ایک جامع اردو لغات کی ترتیب +

(۴) اُردو مرکز کی مجلس اُدَبا (جو درحقیقت اُردو زبان کے لئے ایک اَدَبی دارالافتاء ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و متنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا +

ایک باوقار علمی جماعت جس میں ملک کے سربرآوردہ اہلِ قلم اور منتخب انشاپرداز شریک ہیں اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہے - اس کی پہلی زرّین کوشش تیس گرانقدر مجلّدات کی صورت میں قدرشناس نگاہوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے - آنریبل سر شیخ عبدالقادر بالقابہ - خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی - ای - ایس - پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے نقادانِ ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلّدات جماعت اُردو مرکز نے ترتیب دِئے ہیں - قدرشناس اہل نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی - تو ہم کم و بیش ڈیڑھ سو مجلّدات شائع کرکے اُردو مصنّفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کر دینگے +

تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحاد و چیف ایڈیٹر اردو مرکز لاہور

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس واقع ایبٹ روڈ لاہور میں باہتمام بابو گورانتا مل صاحب مینجر شائع ہوئی +

فہرست

پیامِ زندگی جلد نہم

شہادت حضرت عباس

اس جلد میں میر نفیس، سلیس۔ رئیس، وحید۔ امین
عارف، جاوید۔ رشید، کامل، ناظم کے مراثی کا انتخاب
درج کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد سوئم

حضرتِ عبّاس

میر نفیس

عبّاس نامدار کو جس دم رضا ملی
پایا شرف سعادتِ قربِ خدا ملی
جان آگئی کہ دردِ جگر کی دوا ملی
رخصت ملی کہ دولتِ لا انتہا ملی

دے کر دعائیں شہ کے قدم چومنے لگے
اُٹھ کر قدم سے مثلِ اسد جھومنے لگے

اس کی خوشی جو تھی کہ ملی اب رہِ ثواب
چہرہ کا رنگ سرخ ہُوا مثلِ آفتاب
تیغ و سپر اٹھا کے جری نے بہ آب و تاب
پٹکا کمر سے باندھ لیا مثلِ بوتراب

جوش آگیا فزوں ہوسِ جنگ ہوگئی
بالیدگی سے تن پہ زرہ تنگ ہوگئی

آواز دی سکینہ کو بڑھ کے کہ مشک لاؤ
رخصت ملی حضور سے آنسو نہ اب بہاؤ

مادر سے کہدو پیاس کا اصغر کے غم نہ کھاؤ اب جلد پانی لینے کو جاتے ہیں آؤ آؤ
قبضہ ہو نہر پر گھر آرزو ملے
بھر لائیں مشک اب تو ہمیں آبرو ملے

خوں میں بھریں لڑیں سپہ بدصفات سے ہوں سرخرو جہاں میں شہِ کائنات سے
پیاسی ہو تین روز سے اور تین رات سے پانی تمہارے واسطے لائیں فرات سے
اس غم میں کس طرح نہ کلیجہ فگار ہو
ان سوکھے ہونٹوں پہ عمو نثار ہو

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولی وہ حق شناس کھوؤں ہیں آپ کو مجھے ایسی نہیں ہے پیاس
ماتم میں ہیں سحر سے امام فلک اساس پھر کون ہے اگر نہ رہے آپ شہ کے پاس
تھامے گا کون فاطمہ کے نور عین کو
تنہا نہ کیجئے مرے بابا حسین کو

شہ نے کہا کہ ان کو نہ روکو پدر نثار ان کی یہی خوشی ہے تو کیا اپنا اختیار
منظورِ حق ہے گر تو پھرے گا یہ ذی وقار اب آگے جو رضائے خدا اے جگر فگار
دل چاہتا ہے ان کو نہ دم بھر جدا کریں
لیکن تمہیں کہو کہ بجز صبر کیا کریں

اتنے میں خیمہ گاہ سے نکلا وہ نیک نام روئے جو اہل بیت تو ہلنے لگے خیام
زینب پکار رہی ہائے اکیلے ہوئے امام چلائے شاہ ہم بھی کوئی دم میں ہیں تمام
تنہا جہان میں پسرِ فاطمہ ہوا
زینب ہمارے گھر کا بس اب خاتمہ ہوا

آیا جو در پہ وہ گُلِ بستانِ حیدری
دیکھا ٹہل رہے ہیں علی اکبرِ جری

چہرہ ہے سرخ صورتِ خورشیدِ خاوری
آنکھوں سے آشکار ہے رعبِ غضنفری

ظاہر نظر سے شیرِ خدا کا جلال ہے
قبضہ میں تیغِ تیز ہے کاندھے پہ ڈھال ہے

عباس بولے خیر تو ہے میرے آفتاب
کی عرض خیریت ہے مشوش نہ ہوں جناب

رخصت طلب تھے خیمہ میں آپ اے فلک مآب
بڑھ آئی تھی ادھر سپہ خانماں خراب

کہتے تھے سب کہ گھیر لو چل کر امام کو
آیا ہوں میں ہٹا کے ابھی فوجِ شام کو

گھوڑے کی تعریف

در پر عجب شکوہ سے حاضر ہوا فرس
ساکت نہ تھا جو صورتِ سیماب یک نفس

وہ سم وہ دم وہ یال وہ گردن وہ پیش و پس
وہ تیز رو نہ جس سے چلے کچھ ہوا کا بس

خوش رو و شوخ چشم و جہاں سیر و خوشخرام
چھلکے نہ آب ہاتھ میں راکب کے گر ہو جام

عباس نامدار نے

تنکر جو باگ اُٹھائی سوئے فوجِ خیرہ سر
پنہاں ہوا نظر سے کمیت خجستہ فر

قربان سرعتِ فرسِ سربلند کے
ثابت ہوا کہ پر نکل آئے سمند کے

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں:۔

وہ گشت وہ غضب کے طرارے وہ جست و خیز
زلفِ پری سے یال دل آویز مشک بیز

پر خشم چشم صورتِ ضیغم دمِ ستیز
جولانیوں میں صرصرِ ورفرف سے تند و تیز
وارفتگی تھی کبک کو حیرت غزال کو
رہ رہ کے دیکھتی تھی ہوا اس کی چال کو

یاں سے اڑا کے رخش کو پہنچا جو وہ ہژبر
سب یوں ہٹے ہوا سے سمٹتا ہے جیسے ابر
ہاتھوں سے شہسواروں کے چھوٹی عنانِ صبر[1]
ٹھیرا فرس کو روک کے شیرِ خدا کا ببر
آنکھیں پھرائیں نہر کی موجوں کو دیکھ کر
گردن ہلائی گھاٹ کی فوجوں کو دیکھ کر

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

چھایا جو رعب حضرتِ عباس نیک خو
مضطر مثالِ موج ہوئی فوج کینہ جو
ریتی سے ایک شور اٹھا تا کنار جو
اس سے وہی لڑے جسے کھونی ہو آبرو
افسرِ لشکر سپاہیوں سے کہنے لگا۔

ہشیار مورچوں سے خبردار نہر سے
آگے صفیں بڑھی رہیں دو چار نہر سے
آیا ہے پانی لینے یہ جرار نہر سے
ہاں صفدرو سرکیو نہ زنہار نہر سے
پیاسا ہے غیظ میں ہے جری ہے دلیر ہے
ندی پہ آنہ جائے کہ شیروں کا شیر ہے

گونجا جو آستیں کو الٹ کے وہ شیر نر
کانپے سران فوج کے دل ہل گئے جگر
نعرہ کیا غضب میں کہ اے فوجِ بدگہر
تم سے رکیں گے حیدر کرار کے پسر

---

[1] عنانِ صبر ہاتھ سے چھوٹ جانا۔ بے صبر ہو جانا۔

یہ ہاتھ جس وغا میں بڑھے پھر رکے نہیں
تھی کون سی مہم جسے سر کر چکے نہیں
ہم سے نہیں کسی کو جہاں میں مجال جنگ
بچپن سے ناخنوں[1] میں ہی اپنے کمال جنگ
موت آئے اسکی ہم سے کرے جو سوال جنگ
کانپے فلک، ہمیں اگر آئے خیال جنگ
قبضہ ہے اپنا خلق میں تلوار جب سے ہے
عزت بہادری کی ہمارے سبب سے ہے

اس تقریر سے سپاہِ غنیم میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اسوقت کہتے ہیں۔

ظاہر ہوا سپاہ میں جس دم یہ انتشار
مضطر ہُوا کمال ابن سعد بدشعار
جاکر قریبِ میمنہ بولا وہ نابکار
حاضر ہوں جتنے ہیں یہاں لشکر میں نامدار
رن سے اکھڑ گئے جو نشاں تھے گڑے ہوئے
یہ کیا کہ بھاگ آئے ادھر بے لڑے ہوئے

افسر کو غضب آلود دیکھکر ایک پہلوان جس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ؎

رستم کو زالِ شیر کو آہو سمجھتا تھا
اُس کو یزید جوشنِ بازو سمجھتا تھا

ابن سعد سے عرض کرتا ہے کہ حضور:۔

تشویش کون سی جو ہٹا لشکرِ گراں
لاتا ہوں جا کے میں سرِ عباسِ نوجواں
پلٹا یہ کہہ کے صورت رستم وہ پہلواں
سر میں غرور طبع میں شورش کہ الاماں

---

[1] کمال جنگ ناخنوں میں ہے۔ یعنی فن جنگ میں مہارت تامہ حاصل ہے۔

جنگی کئی غلام بد اختر کے ساتھ تھے
سب حربے وہرے دہرے ستمگر لگیا تھ تھے

چھیڑا فرس تو ہلنے لگا دشتِ کربلا حلقے میں دو ہزار زرہ پوش کے چلا
تیوری چڑھا چڑھا کے یہ کہتا تھا برملا ہے میری تیغ اور علمدار کا گلا
سر کاٹوں پیدلوں کے سواروں کا خوں کروں
یہ ہاتھ ہیں وہ جن سے ہزاروں کا خوں کروں

جب وہ بڑھا تو فوج کے بھی پھر قدم بڑھے لشکر کے سب نشاں ہوئے اونچے علم بڑھے
پیدل بڑھے سواروں کے دستے بہم بڑھے ڈنکا ہوا لڑائی کا اہلِ ستم بڑھے
ہر سمت کثرتِ تبر و تیغ و تیر تھی
آگے تو وہ تھا فوج کی پیچھے بہیر تھی

کس طنطنہ سے سامنے آیا وہ پہلواں سنبھلے ادھر فرس پہ علمدارِ نوجواں
دستِ قوی میں تول کے شمشیرِ سرفشاں دیکھا غزال نے طرفِ شیرِ ناگہاں
لشکر میں غل ہوا کہ دمِ گیر و دار ہے
دی موت نے صدا کہ یہ پہلا شکار ہے

اس وقت :-

چنگھاڑ کر وہ دیو پکارا مثالِ سام[۱] ہشیار تیغ و گرز سے یہ موت کا پیام

تیغیں ہوں سو تو ڈھال کو کھولوں نشست سے سرمہ[۲] کروں پہاڑ کو ضربِ درشت سے

۱ سام ایران کے مشہور پہلوان رستم کا باپ تھا ۲ سرمہ کردینا بسرمہ کی طرح پیس ڈالنا۔

حضرت عباس جواب میں فرماتے ہیں۔

ہم پر کھلا ہوا ہے تری قوتوں کا حال
شیروں سے جنگ کیا تری طاقت ہی اوشغال
ضیغم کا طیش و غیظ کہاں اور کہاں غزال
تیغ علی کے سامنے کیا کرگدن کی ڈھال
شاہیں کے آگے کبک نکلتا نہیں کبھی
کرگس کا بس عقاب پہ چلتا نہیں کبھی

دعویٰ ہے گر تو ہم کو لڑائی کے فن دکھا
زور آوری شجاعوں کی او پیل تن دکھا
لے تیغ ڈھال روک وغا کا چلن دکھا
نیزہ ہلا کمان اٹھا بانکپن دکھا
ہاں آزمالے کھول کے دل زور و ضرب کو
پھر دیکھ تین روز کے پیاسے کی حرب کو

گرز گراں اُٹھا کے بڑھا وہ وغا پسند
عباس نامور نے بھی جولاں کیا سمند[1]
وار اس شقی کا روک کے تلوار کی بلند
قربان زور و ضرب علمدار ارجمند
آفت نئے طریق سے آئی عمود پر
کٹ کر اسی کا گرز گرا اُس کے خود پر

بھالا ہلا کے واں سے بڑھا پھر وہ پہلواں
جس کی سناں تھی افعئ پر زہر کی زباں
یاں سے چلے جلال میں عباس نوجواں
چٹکی میں تھام کر وہ چمکتی ہوئی سناں
جھٹکا دیا کہ جھک کے تگاور سنبھل گیا
ساعد سے زور ہاتھ سے نیزہ نکل گیا

اس کے بعد کہتے ہیں۔

---

[1] سمند جولاں کرنا۔ گھوڑے کو دوڑانا۔

خادم سے لے کے دوسرا برچھا بکر دفر جھپٹا غضب میں آکے وہ موذی کہ الحذر
یاں اُس جری نے کھینچ کے شمشیر شعلہ در اک اک گرہ تراش دی مانندِ نیشکر

پھر تو۔

تلوار کھینچی غیظ میں اس بدمآل نے
سینہ ادھر بڑھا دیا صفدر کی ڈھال نے

جنگ شروع ہوگئی اور دونوں طرف سے وار ہونے لگے۔

ناگہ بروئے فرق پڑی تیغ شعلہ خو مغفر سے چاک تابہ گلو ہو گیا عدو
دریا پہ بہ گیا ستم ایجاد کا لہو کی تیغ آبدار نے خاک اُس کی آبرو
مثلِ مکانِ کہنہ وہ پیماں شکن گرا
کڑیاں زرہ کی ٹوٹ گئیں قصرِ تن گرا

سقائے اہل بیت چلا جانبِ فرات نیزوں سے روکنے لگے بڑھکر زبوں صفات
آیا غضب میں بازوئے سلطانِ کائنات قلبِ سپاہِ کیں میں در آیا وہ نیک ذات
بھاگے غزال ڈر کے جدھر شیر پھر پڑا
اک ہاتھ جس پہ چل گیا دو ہو کے گر پڑا

معرکہ آرائی

سر گردنوں سے کٹ گئے جب حملہ ور ہوئے ڈھالوں کے ابر پھٹ گئے جب حملہ ور ہوئے
خوں راکبوں کے گھٹ گئے جب حملہ ور ہوئے مرکب الٹ الٹ گئے جب حملہ ور ہوئے
پیہم صفوں کو توڑتی تھی صف شکن کی تیغ
کرتی تھی منہ ادھر نہ کسی تیغ زن کی تیغ

تلوار کی تعریف

قربانِ تیغِ حضرتِ عباس نامور نصرت پناہ - ملک ستاں - دافع ضرر
سلمائے فتح کفر شکن لیلئی ظفر خوش قد - وغا پسند - فروتن - بلند سر
پی سے لہو رگوں کا وہ نشتر بھرے ہوئے
تیزی زباں میں سینہ میں جوہر بھرے ہوئے

اندازِ بیان

وہ قد وہ خم وہ دونو طرف جوہروں کی ضو آئینۂ عروس و غارشکِ ماہِ نو
شمعِ رہِ مصاف چراغِ ظفر کی لو کہنے کو ایک تیغ مگر خوبیاں ہیں سو
جب وہ چلی ہزاروں کی جانوں پہ بن گئی
ابرو سے بل گیا نہ جبیں سے شکن گئی

زورِ بیان

ممتازِ دل نواز سرافراز سربلند نصرت طراز خانہ برانداز بہرہ مند
طرار - جاں شکار جہاندارِ دل پسند عاجز نہ جنگ میں نہ کسی معرکہ میں بند
ضربت سے اُس کی چاک کلیجہ سپر کا ہے
جوہر نہ جانیو یہ نوشتہ ظفر کا ہے
منصور و فتحیاب و خوش اسلوب و خوشجمال نصرت مآب و قلعہ کشا و ظفر مآل
پرقہر و تند خو ظفر اندیش و بےمثال خاموش سرخ پوش بلانوش باکمال
سرگرمِ قتل ہو تو نہ دم ایک آن لے
دوزخ سے پھر نکل نہ سکے جسکی جان لے

لڑتا ہوا گیا جو وہ جرار گھاٹ پر
پہرے کے لوگ ہو گئے ہشیار گھاٹ پر
چمکی جو برق تیغ شرربار گھاٹ پر
بھاگے وہ جمع تھے جو کماندار گھاٹ پر
روکے تھی جو فرات کو وہ فوج ہٹ گئی
ساری زمیں ترائی کی لاشوں سے پٹ گئی

اس کے بعد ؎

اترا میانِ بحر جو وہ منبعِ کرم
بڑھ کر حباب آنکھوں سے ملنے لگے قدم

پانی پر نگاہ پڑتے ہی تشنگیٔ اہل بیت کا خیال آتا ہے۔ اُس وقت آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اسی حالت میں آب رواں سے خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

کیوں آب سرد تجھ سے ہیں سیراب رو سیاہ
خیمہ میں جاں بلب ہے سکینہ عطش سے آہ

خشکیدہ لب نہ تڑپیں شہِ مشرقین کے
محروم تجھ سے یوں رہیں بچے حسین کے

اس کے بعد:۔

یہ کہہ کے اس جری نے کیا مشک کو پر آب
باندھا دہانہ زانو پہ رکھ کر با آب و تاب
تسمہ گلے میں ڈال کے بیٹھا وہ آفتاب
نکلا نشیب سے فرس ابنِ بوتراب
بھر لائے مشکِ آب جو اس صفدری کے ساتھ
گھوڑا بھی تشنہ لب نکل آیا جری کے ساتھ
پہنچا کچھار تک جو ید اللہ کا پسر
نیزے اٹھا اٹھا کے بڑھی فوج اہلِ شر

غل تھا ادھراب آنے نہ پائے یہ نامور لاکھوں جواں اُدھر تن تنہا جری اِدھر
بس زندگی سے یاس ہوئی اس دلیر کو
گھیرا ستمگروں نے ترائی میں شیر کو
اک جان اور لاکھ جفا کار کیا کریں رستے ہیں بند گرد ہیں خونخوار کیا کریں
طاقت جواب دیتی ہے ہر بار کیا کریں ہمدرد ہے کوئی نہ مددگار کیا کریں
نزدیک موت خیمہ شبیر دور ہے
تیغیں پڑیں ہیں تن پہ بدن چور چور ہے
مرکب کو سوئے خیمہ بڑھاتے ہیں بار بار نیزوں کی زد کو دیکھتے جاتے ہیں بار بار
بڑھ کر شقی قریب جب آتے ہیں بار بار جھک جھک کے مشک آب بچاتے ہیں بار بار
دل غم سے بیقرار ہے صدمہ جگر پہ ہے
زیر سپر ہے مشک تو سینہ سپر پہ ہے
دل سے یہ ہے دعا کہ خدا مشک کو بچائے کیونکر یہ آب سوئے سکینہ کے پاس جائے
بنتی نہیں ہے اب کوئی تدبیر ہائے ہائے ہاتھ آئے آب اور حرم تک نہ جانے پائے
بہ جائے جسم زار کا خوں زندگی نہ ہو
یارب مجھے سکینہ سے شرمندگی نہ ہو

مگر دونوں بازو شانوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ علم زمین پر گر پڑتا ہے۔ مشک میں ایک قطرہ باقی نہیں رہتا۔ آخر کار آپ خود بھی شہید ہو جاتے ہیں

طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن حسنِ بندش سے نمودار ہے لمعانِ سخن
نظم ہے دُرِ گراں مایۂ عمانِ سخن ہے زباں بلبلِ خوش لہجۂ بستانِ سخن

سحر و شام عجب سیر کیا کرتا ہوں
مثلِ قمری اسی گلزار کا دم بھرتا ہوں

صاف و شفاف و مصفا دلِ بے کینہ رہے کم نہ ذرہ ہو وہی الفتِ دیرینہ رہے
آگے ہر دوست کے اس طرح صفا سینہ رہے جس طرح سامنے آئینہ کے آئینہ رہے

قلب میں نور رہے بدر کے پرتو کی طرح
اوج بھی پاتے تو جھک جائے مہِ نو کی طرح

جنابِ امام سقائے نامدار سے کہہ رہے ہیں ؎

گاہوارے میں دمِ صبح سے اصغر ہے نڈھال
دیکھا جاتا نہیں اب آنکھوں سے معصوم کا حال

سن کے یہ ہو گئے بیتاب علمدار امام عرض کی شہ سے کہ اب جاتا ہی در بابِ غلام
سب نکل آئے ہیں خیمہ سے علی کے گلفام دیکھیے در پہ کھڑے روتے ہیں خالی لئے جام

کس سے کہئے کہ صغیروں پہ ترس کھائے کوئی
خوف ہے پیاس سے معصوم نہ مر جائے کوئی

اب کسی طرح نہیں دل کو مرے صبر کی تاب آتشِ غم سے کلیجہ ہوا جاتا ہے کباب
گلشنِ فاطمہ زہرا کے ہیں غنچے بے آب پوچھیں گے ساقیٔ کوثر تو میں کیا دوں گا جواب

ضعف ایسا ہے کہ اب اٹھ بھی نہیں سکتے ہیں
ہائے کس پیاس سے بچے مرا منہ تکتے ہیں

جناب امام سے اذنِ جنگ لیکر حضرت عباس حرم سے ملنے جاتے ہیں۔ بچے دوڑ کر دامن سے لپٹ جاتے ہیں۔ اس وقت

کوئی کہتا تھا کہ اے بازوئے سلطانِ انام
بہرِ حق نہر سے بھر کر ہمیں لا دیجئے جام
کوئی کہتا تھا کہ ہم سوزِ عطش سے ہیں تمام
کوئی کہتا تھا کہ خیمہ میں نہیں پانی کا نام
حال یہ دیکھ کے منہ آنسوؤں سے دھونے لگے
دِل پہ صدمہ ہوا عباس علی رونے لگے

اور ؎

گھر میں سمجھاتے ہوئے بچوں کو عباس گئے
ہاتھ پکڑے ہوئے سب طفل چپ و راس گئے

دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت زینب سکینہ کو دلاسہ دے رہی ہیں۔ کہ بی بی گھبراؤ نہیں تمہارے چچا ابھی پانی لے کر آتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عباس پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ جوشِ محبت سے مغلوب ہو کر

آپ نے گودی میں اس وقت بھتیجی کو لیا
ہونٹھ سے سوکھے ہوئے ہونٹھ ملے پیار کیا
اور یہ فرما کے پھر آغوش میں زینب کے دیا
میری شہزادی نے پانی نہیں دو دن سے پیا
مشک بھرنے کیلئے نہر پہ جب جاؤں میں
تم دعا مانگو کہ اعدا پہ ظفر پاؤں میں

اس کے بعد ؎

سب سے رخصت ہوئے خیمے میں علمدارِ امام
مشک لیکر جو چلے پڑ گیا گھر میں کہرام

جناب امام خیمہ سے نکلے تو بھائی کو مستعدِ جنگ دیکھ کر ؎

شہ نے فرمایا کہ قابو میں نہیں ہے دلِ زار
ہائے کس منہ سے کہوں ہیں کہ ہو گھوڑے پہ سوار

سقائے نامدار ترائی کے سامنے پہنچ جاتا ہے! اور لشکرِ غنیم کو خالی مشک دکھا کر اُن سے کہتا ہے۔

منہ سے جو کہتے ہیں جرا رو ہی کرتے ہیں
جان کچھ چیز نہیں بات پہ ہم مرتے ہیں
کوچۂ صبر میں جانباز قدم دھرتے ہیں
جا کے اس نہر سے مشکیزے کو ہم بھرتے ہیں

جو نہیں لاکھوں سے رکتا وہ دلیر آتا ہے
دور ہو جاؤ ترائی سے کہ شیر آتا ہے

یہ سنتے ہی لشکرِ شام حرکت میں آجاتا ہے ؎

قدر انداز بڑھے قوس میں جوڑے ہوئے تیر
طبل کا شور اُٹھا، گونج گئی نے کی صفیر

ادھر علمدار بھی شمشیر کو بے نیام کرتے ہیں۔ اور گھوڑا اڑا کر لشکر میں در آتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

جا بلا صف سے فرس تیغ علمدار چلی
سر اڑے تن سے ہوا موت کی اکبار چلی

اپنی کثرت پہ غلط فہم بہت بھولے تھے
کٹ گئے کھیت میں جو نخلِ حسد پھولے تھے

اس وقت۔

تھی نئی طرح کی ہلچل میں سپاہ اشرار
پیدل اسواروں میں بھاگ آئے پیادوں میں سوار

قدر اندازوں میں تھی برچھیوں والوں کی قطار　　آتشِ تیغ کی دہشت سے نہ تھا اک جا قرار

پہلواں سارے لڑائی کے چلن بھول گئے

ناوک اندازیوں کو تیر فگن بھول گئے

آپ کی تیغ آبدار نے

جسم سے کر دیئے سر وقتِ زدو کشت جدا　　مشت سے کٹ کے ہوئے گرزگراں مشت جدا

پشت سے ڈھال جدا ڈھال سے تھی پشت جدا　　تیغ سے ہاتھ جدا ہاتھ سے انگشت جدا

نخل قد قطع کئے خون سے رن لال کیا

اسے کاٹا اُسے چھانٹا اسے پامال کیا

جراتِ بازوئے سرور ہی بیاں سے باہر　　اس طرف لڑتے تھے لیکن سوئے دریا تھی نظر

تیغ سے جب متفرق ہوا سارا لشکر　　جانبِ نہر بڑھا شیرِ الٰہی کا پسر

ہٹ گئی فوجِ شقی جان بچانے کے لئے

گھاٹ کی راہ کھلی شیر کے جانے کے لئے

لبِ جو جمع نگہباں تھے جو چالیس ہزار　　آگے اسوار تھے پیچھے تھی پیادوں کی قطار

تیغیں کھینچے ہوئے آمادہ کھڑے تھے غدار　　نیزے سیدھے کئے موجود تھے سب تجربہ کار

شور تھا بڑھ کے علمدار جواں کو روکو

آنے پائے نہ ادھر شیرِ ژیاں کو روکو

سن کے یہ ایک جواں گھاٹ کی لشکر سے بڑھا　　غرق تھا لوہے[۱] کے دریا میں وہ مردودِ خدا

پہلواں رستم و دستاں سے بھی قوت میں سوا　　اس کے پیچھے تھے کمک کو کئی اہلِ جفا

[۱] لوہے کے دریا میں غرق ہونا۔ یعنی ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہونا۔

سب سے کہتا تھا کہ میں بہرِ وغا جاتا ہوں

سرِ عباس معہ مشک و علم لاتا ہوں

یہ فیل مست حضرت عباس کے سامنے پہنچ کر اس طرح چنگھاڑتا ہے۔

پہلواں آنکھ چرا جاتے ہیں تیور سے مرے ۔۔۔ وار رکتے نہیں دو بھی کسی لشکر سے مرے

خشک ہو جاتا ہے ضیغم کا لہو ڈر سے مرے ۔۔۔ سنگِ فولاد لچک جاتا ہے لنگر سے مرے

منہ پہ چڑھتا نہیں میرے کوئی رہواروں میں

سر برآوردہ ہوں لشکر کے نموداروں میں

سن کے یہ غیظ میں آیا شہِ مرداں کا پسر ۔۔۔ بڑھ کے نعرہ جو کیا ہل گیا خود سر کا جگر

تول کر تیغ شرربار اٹھائی جو سپر ۔۔۔ اُن کا خوں گھٹ گیا جو گھاٹ پہ تھی بانی شر

نہ فقط ڈر کے صفِ لشکرِ پر قہر ہٹی

سب ترائی کی زمیں سوکھ گئی نہر ہٹی

دی یہ آواز کہ ہم سے کوئی لڑ سکتا ہے ۔۔۔ بس خموش او ستم ایجاد یہ کیا بکتا ہے

دو کریں گے تجھے طاقت میں اگر یکتا ہے ۔۔۔ یہی دعوٰی ہے تو بڑھ کیوں مرا منہ تکتا ہے

دشت لٹتے جو دکھائیں اسد اللہ کا زور

دست و بازو میں ہمارے ہے ید اللہ کا زور

یہ سُن کر حریف پہلوان جوش میں آجاتا ہے۔ اور تیر باری شروع کر دیتا ہے

آپ تلوار سے سب تیر کاٹ دیتے ہیں۔

جب یونہی خاک پہ کٹ کٹ کے گرے سارے خدنگ ۔۔۔ اُڑ گیا چہرۂ منحوس خطا کار کا رنگ

۱؎ آنکھ چرانا ۔ نظر بچانا۔

دی جگر گوشۂ حیدر نے صدا کیوں سرِ جنگ — ہنر تیر میں اُستاد بھی تھا تو دمِ جنگ
ویسے دم اسکا عبث بھرتا ہے سرکش خالی
اور کچھ تیر ہیں یا ہوگیا ترکش خالی

اس کے بعد پھر جنگ شروع ہوتی ہے۔

مل گئے بڑھ کے فرس چلنے لگے تیغوں کے وار — برق کا ڈھنگ دکھانے لگے دونوں رہوار
جم کے مڑ جاتے تھے جب اشہب صرصر رفتار — ٹکڑے اُڑ جاتے تھے مقتل کی زمیں کے ہر بار
ایک پر ایک فرس غیظ میں منہ کھولتا تھا
ٹاپ کی آتی تھی آواز کہ رن بولتا تھا

خون کے گھونٹ[۱] جو پی کر وہ ستمگار بڑھا — دل بڑھانے[۲] کو اُدھر لشکر اشرار بڑھا
ہاتھ سرکش کا سوئے فرق علمدار بڑھا — وار رد کر کے اُدھر سے بھی وہ جرار بڑھا
دست و بازوئے شہِ دیں جو بڑھا تیغ کیساتھ
ہاتھ ظالم کا جدا ہو کے گرا تیغ کے ساتھ

حملہ جب کرتا تھا فرزند شہِ قلعہ شکن — بید کی طرح جفا جو کا لرزتا تھا بدن
لب پہ لایا وہ شقی بے ادبانہ جو سخن — پیپلا تیغ کا بس پڑ گیا بالائے دہن
دیکھکر فوجِ لعیں ہاتھ ادھر ملتی تھی
کٹ گئی منہ میں جو قینچی[۳] سی زباں چلتی تھی

دست پاچہ تھا کہ پھر سن سے چلی تیغ دو دم — ہاتھ بایاں بھی سرِ دست گیا تن سے قلم
تن کے فرمایا علمدار جری نے اسدم — اب بتا زور میں ہے کون سوا کون ہے کم

۱؎ خون کے گھونٹ پینا۔ غم و غصے کی حالت مراد ہے ۲؎ دل بڑھانا۔ حوصلہ افزائی کرنا ۳؎ قینچی سی زبان چلنا۔ تیز تیز باتیں کرنا۔

دیکھ حیرت میں ہیں جو لوگ ترے ساتھ ہیں یہ
کوہ کو ریلتا تھا جس سے وہی ہاتھ ہیں یہ

کہہ کے یہ تیغ لگائی جو شقی کے سر پر
صاف وہ ہو گیا مرحب کی طرح تا بہ کمر
مل گیا خاک میں سب زورِ تنِ بانیٔ شر
شیر سے مشک و علم آیا اٹھا لینے کو ادھر
آبرو کھو کے بہشتی سے لڑائی میں گرا
سرد ہو کر ستم ایجاد ترائی میں گرا

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

رن میں جب تیغ جگر بند ید اللہ گری
گہ بڑھی گاہ پھری گاہ اٹھی گاہ گری
غل اٹھا ہو کے جو بے سر صف بد خواہ گری
قلعۂ شام کی دیوار سرِ راہ گری
راستہ کھل گیا تھا نہر گذرنے کے لئے
تختۂ پل بن گیا غازی کے اترنے کیلئے

حضرت عباس نہر میں داخل ہوتے ہیں۔ جھک کر چلو میں پانی لیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ منہ پر چھڑک لیں۔ مگر

واہ رے صبر علمدار شہ نیک خصال
دھیان آیا کہ ہے پیاسا شہ لولاک کا لال
ہاتھ سے پھینک دیا آب بصد رنج و ملال
مشک بھرنے پہ گیا اپنی عطش کا نہ خیال
ایک قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہ پیا
منہ اٹھائے رہا گھوڑے نے بھی پانی نہ پیا

کر کے شاباش کیا مرکبِ جاندار کو پیار
مشک پر آب لئے نہر سے نکلا جرار
رخ کیا خیمۂ اقدس کا اڑا کر رہوار
کچھ بڑھے تھے کہ قریب آ گئے سب ظلم شعار

کثرتِ افواج کی پہلے سے بھی دہ چند ہوئی
جو نکل جانے کی تھی راہ وہ سب بند ہوئی

دوش سے مشک کو عباس نے ہرنے پہ دھرا مشک پر ڈھال رکھی ڈھال پہ دامانِ قبا
گہ اُدھر اور کبھی اِس سمت بڑھایا گھوڑا بڑھ سکا پر نہ فرس تھا یہ ہجومِ اعدا

اک یہ آفت تھی کہ جب گھوڑے کو ٹھکراتے تھے
پاؤں رہوار کے ریتی میں دھنسے جاتے تھے

چار جانب سے سمٹ آئی ہے سب فوجِ ستم گرد جلاد ہیں اور بیچ ہیں وہ بحرِ کرم
اس مصیبت میں زباں پر یہ دعا ہے پیہم جاں جاتی رہے بچ جائے مگر مشکِ حرم

تشنہ لب راہ مرے آنے کی تکتے ہونگے
بچّے پانی کیلئے گھر میں بلکتے ہونگے

دایاں بازو شانے سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ آپ یا حافظ و ناصر کہہ کر مشکیزہ پہ جھک جاتے ہیں۔

پھر لگی دوسرے شانہ پہ ستم کی تلوار خاک پر کٹ کے گرا بائیں طرف دستِ یسار
حربے ہاتھوں میں لئے پھر جو بڑھے ظلم شعار نیزہ چھاتی پہ لگا تیر ہوا مشک کے پار

ہے غضب کہہ کے جری رنج و تعب سہنے لگا
مل کے پانی سے بہادر کا لہو بہنے لگا

اندازِ بیان

آہ و فریاد سے ہلتی ہے ترائی کی زمیں مضطرب نہر کا پانی ہے تو موجیں غمگیں
ساکنِ بحر ہیں جتنے وہ ہیں مغموم و حزیں حلقۂ ماتم کا نمودار ہے گرداب نہیں

خاک اڑاتی ہوئی جنگل سے ہوا آتی ہے
ہائے عباس کی دریا سے صدا آتی ہے

طلوع سحر

فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہؤا
فروغ انجم تاباں نہاں نظر سے ہؤا
تمام دہر منور رخ سحر سے ہؤا
ظہور مہر مبیں شہر و دشت و در سے ہؤا
وفور حسن سے چاروں طرف ضیا پھیلی
جہاں میں روشنئ قدرت خدا پھیلی

وہ دور دور بیاض فلک وہ نور سحر
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور وہ ظہور سحر
وہ گلشنوں میں نواسنجئ طیور سحر
نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حور سحر
وہ نور حسن جو اپنا سماں دکھانے لگا
فلک پہ چاند خجالت سے منہ چھپانے لگا

چمن میں دے رہے تھے اٹھ کے باغباں پانی
زمیں چاہ سے تھا ہر طرف رواں پانی
ہر ایک نخل کے تھالے میں تھا رواں پانی
ہؤا تھا آبروئے باغ و بوستاں پانی
فسردگی گئی جان آگئی بحال ہوئے
سحر کو خرم و سیراب سب نہال ہوئے

ہر ایک باغ کو یوں باغباں کریں سیراب
چمن کو فاطمہ کے دیں نہ آب خانہ خراب
کلیجے لالہ رخوں کے ہیں سوز غم سے کباب
وہ لب ہیں خشک جو تر تھے برنگ برگ گلاب
پئے یزید کی تو فوج دمبدم پانی

رسولِ حق کے نہ بچوں کو ہو بہم پانی

حرم میں غل ہے کہ عباس نامور کو بلاؤ سکینہ مرتی ہے اک جام آب ڈھونڈ کے لاؤ
خیام میں رفقائے امام پاک کے جاؤ بچا ہوا کہیں قطرہ بھی ہو تو یاں سے آؤ

روانہ خلق سے یہ لالہ فام ہوتا ہے
غضب ہوا علی اصغر تمام ہوتا ہے

ادھر ہے نہر کو روکے ہوئے سپاہ گراں تمام گھاٹ ہیں کثرت سے شامیوں کی نہاں
کھڑے ہیں نہر پہ آہن میں غرق لاکھ جواں ہجوم فوج سے حیران خود ہے آب رواں

کنار جو ہیں جفا جو پرے جمائے ہوئے
مثال ابر سیہ دل پہ دل ہیں چھائے ہوئے

چمک سنانوں کی جاتی ہے تا بہ چرخ بریں صدائے کوس و دف دنے سے ہل رہی ہے زمیں
سیاہ و سرخ کھلے ہیں نشان لشکر کیں سوئے یسار ہے شمر ابن سعد سوئے یمیں

ادھر فوج حسینی بھی آمادۂ جنگ ہے۔ حضرت علی اکبر صفوں کی ترتیب میں مصروف ہیں

مرقع نگاری

علم کے پاس ہیں سب نور عین شاہ نجف عیاں خوشی سے ہے شان و جلال و عز و شرف
کھڑے ہیں صورت شیر اِلٰہ تیغ بکف صفیں تھیں فوج کی یا سطر ہائے سورہ صف

حسین جلوہ نمایوں ہیں ان ستاروں میں
قمر کا سورہ ہے جس طرح تیس پاروں میں

زہے جلال علمدار شاہ عرش اساس خدا کے شیر کے دلدار حضرت عباس

کہ جسکے رعب سے چھایا ہے لشکروں پہ ہراس سپر کیئے ہوئے سینہ ہیں شاہزادوں کے پاس
دعائیں جینے کی ہر اک جری کو دیتے ہیں
کوئی جو بڑھتا ہے صف سے تو روک لیتے ہیں
یہ حال ادھر تھا کہ نیر اس طرف سے آنے لگے رفیق آپکے لے لے کے اذن جانے لگے
مثال شیر ژیاں جراتیں دکھانے لگے اُٹھا کے زخم لہو میں جری نہانے لگے
فدائے راہ الٰہی ہر اک سعید ہوا
حسین لاش اٹھا لائے جو شہید ہوا
عزیز شاہ کے آمادۂ جدال ہوئے دغا سے اُن کی تو عاجز جفا خصال ہوئے
شہید زینب و مسلم کے نونہال ہوئے حسن کے لال بھی آخر لہو میں لال ہوئے

ابھی امام پاک ماتم جگر گوشہ حسن سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ فرشتہ مرگ نے سقائے نامدار کو پیش کر دیا۔ اب یہ حالت ہے۔ کہ حضرت عباس بھائی سے اذن جنگ لے چکے ہیں۔ اور میدان کارزار کو روانہ ہونے والے ہیں۔ اس وقت

سجا ہوا درِ دولت پہ تیز گام آیا پری کی چال سے شبدیز خوشخرام آیا
گراں رکاب و سبک سیر خوش لجام آیا قریب بازوئے شاہ فلک مقام آیا
بلند کوکب اقبال نامدار ہوا
نشان و مشک لئے باوفا سوار ہوا

گھوڑے کی تعریف

سوار ہوتے ہی طاؤس بن گیا رہوار کیا جو دم کو چنور اور ہوگئی رفتار

بڑھا وہ یوں کہ چلے جس طرح نسیمِ بہار طرارے بھرنے لگا مثل آہوئے تاتار[1]

شجاع جو ہے سواری میں اس دلیر کی ہے

ہرن کی آنکھ ہے لیکن نگاہ شیر کی ہے

دمِ جدال جری بھی ہے باوفا بھی ہے سحاب کا بھی چلن تیزی ہوا بھی ہے

روش بھی برق کی ہے سرعتِ صبا بھی ہے ہما نہیں ہے سعادت میں پر ہما بھی ہے

دمِ جدال قدم غازیوں کے بڑھتے ہیں

شجاع ایسے ہی گھوڑوں سے رن پہ چڑھتے ہیں

حضرت عباس میدان میں پہنچتے ہی نہر کا قصد کرتے ہیں۔ آپکو دیکھ کر

پکارا شمر گذرنا بہ نہر ہے دشوار کنارے جسکے محافظ کھڑے ہیں تیس ہزار

کہا بڑھے گا جو ضرغامِ حیدرِ کرار تو مثل موج کے بھاگیں گے سب یہ ظلم شعار

اگر لڑے تو وہیں جوئے خوں بہاؤں گا

بنا کے لاشوں کا پل تا بہ نہر جاؤں گا

رزمیہ

یہ سن کے فوج ستمگر موج سے خدنگ چلے علم کئے ہوئے تیغوں کو خانہ جنگ چلے

وغا کو بحرِ وغا کے جو تھے نہنگ چلے یلانِ روم سیہ کار و شام و زنگ چلے

بجے دہل گلِ جنگ و جدال کھلنے لگا

غریو غرشِ لشکر سے چرخ ہلنے لگا

---

[1] آہوئے تاتار۔ تاتار ایک علاقے کا نام ہے جہاں کے ہرن مشہور ہیں۔

ساقی نامہ

پلادے ساغرِ پر زور ساقیا جلدی — وہ دے کہ جسمیں ہو نصرت کی بو پلا جلدی
بس اب صراحی و ساغر اٹھا کے لا جلدی — شروعِ جنگ ہے چھلکا[۱] کے جام آ جلدی
زیادہ جوش میں جرات کا نشہ چڑھتا ہے
وغا کو ساقیِ کوثر کا لال بڑھتا ہے

پناہ تیغِ علمدار سے کسیکو نہ تھی — اماں جدال میں جرار سے کسیکو نہ تھی
جگہ بچاؤ کی تلوار سے کسیکو نہ تھی — مفر کی شکل بھی کرار سے کسیکو نہ تھی
حسام جلوہ نما سر پہ تھی جدھر جاتے
حصار کر لیا تھا موت نے کدھر جاتے

رکی کسی سے نہ وہ لشکرِ گراں میں کبھی — کبھی خدنگ میں تھی حلقۂ کماں میں کبھی
کبھی رگوں میں در آئی تو استخواں میں کبھی — سروں میں غرق کبھی جسمِ پہلواں میں کبھی
کوئی تڑپتا تھا مرتا تھا بے اجل کوئی
پڑا تھا پشت کے بل کوئی منہ کے بل کوئی

لگائے ہاتھ کبھی دو ادھر تو چار کبھی — نہاں تھی مثلِ نہنگ اور آشکار کبھی
ابھر کے سر کو اٹھاتی تھی بار بار کبھی — گہہ اس پرے کی طرف اس پرے کے پار کبھی
بھلا کسی سے وہ کب جنگ آشنا رکتی
وہ گھاٹ گھاٹ[۲] کا پانی پئے تھی کیا رکتی

۱؎ چھلکا کے۔ لبالب بھر کر ۲؎ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے تھی۔ مراد بہت تجربہ کار تھی۔

بھگا کے فوج کو پلٹے ہیں حضرت عباس — علی کے شیر کو ہے دو شبانہ روز کی پیاس
ہٹے ہیں اب محافظ جو تھے فرات کے پاس — بڑھا ہے غیظ میں بازوئے شاہِ عرش اساس
خیال ہے تو سکینہ سے وعدہ کرنے کا
بس اب ہے جوش بہشتی کو مشک بھرنے کا

اسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں:-

اُڑا کے اسپ کو ضرغام نہر پر آیا — نظر جو پانی پہ کی دل جری کا بھر آیا
جگر میں تشنگیٔ شہ کا تیر در آیا — سمند نہر میں رکھ کر قدم اتر آیا

پھر

سمند سے سوئے آبِ رواں جھکا وہ جری — بہا کے اشک سکینہ کی چھوٹی مشک بھری
دہانہ باندھ کے دوشِ مبیں پہ اپنے دھری — زباں تھی سوکھی ہوئی رخ پہ آنسوؤں کی تری
یہ دھیان تھا کہ وفا میں نہ کچھ خلل آئے
بہت تھی پیاس مگر تشنہ لب نکل آئے

اس وقت آپ سپاہِ شام کے حلقے میں آجاتے ہیں۔

دعا یہ ہے کہ کسی طرح مشک بچ جائے — یہ تشنہ لب اسے تا خیمہ جلد پہنچائے
حضور ہیں تن تنہا ادھر سے کون آئے — سمٹ کے نکلے جو رستہ کہیں فرس پائے
نہ بڑھنے دو یہی غل ہے ستم شعاروں میں
گھرے ہیں نیزوں میں یوں جیسے پھول خاروں میں

دورانِ جنگ میں آپ کے دونوں بازو کٹ جاتے ہیں۔ مشک تیروں سے چھد جاتی ہے اور پانی قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر بہ نکلتا ہے۔ آخرکار آپ مجروح

ہو کر شہید ہو جاتے ہیں۔

میر سلیس

نسل رسول کی منقبت میں لکھتے ہیں:۔

طاقت بھی اُنکے بازوؤں کا ایک نام ہے
زور ان کا خانہ زاد تہور غلام ہے
اقبال ان کے گھر کا مدارالمہام ہے
ان کی جلو میں فتح و ظفر صبح و شام ہے
ہردم شکوہ جاہ و حشم ساتھ ہے لیے
نصرت کو ان کی غاشیہ بردار کہتے ہیں

فوج اُن کی شان و شوکت و اقبال و جاہ ہے
مردانگی غلام جلالت سپاہ ہے
ثابت قدم ہیں یہ دمِ تیغ ان کی ساہ ہے
جرأت ہے ان کی چشم شجاعت نگاہ ہے
دنیا ہو اک طرف تو یہ کچھ جانتے نہیں
اللہ کے سوا کسی کو مانتے نہیں

حضرت عباس کی شمشیر آبدار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

دلسوز شعلہ خو شرر انداز جاں گداز
لشکر کُش و سکت رسان و ظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دلِ آویز و سرفراز
حاضر جواب تیز طبیعت زباں دراز
اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

گھوڑے کی تعریف

لکھتا ہے اب کمیت قلم سرعتِ سمند
آہو شکار شیر طبیعت وغا پسند
نازک مزاج خوش قد و طناز و سربلند
وہ پیش دپس وہ سم وہ کنوتی وہ جوڑ بند
اتری تھی اک پری فرسِ تند خو نہ تھا
سرعت بھری ہوئی تھی رگوں میں لہو نہ تھا

حضرت عباس لشکرِ غنیم میں تنہا کھڑے ہیں۔

تنہا کھڑے ہیں حضرت عباس تشنہ لب
اور واں پرے جمائے ہیں سفاک جب کے سب
تیغیں علم کئے ہے سپاہِ وغا طلب
ڈھالوں سے اہلِ شام کی دن ہو گیا ہے شب
سرہنگِ روم ورے ہیں وغا پر تلے ہوئے
ہیں دور تک نشانوں کے شقے کھلے ہوئے

حضرت عباس کی معرکہ آرائی کا فوٹو ملاحظہ ہو۔

حملہ دلیر کا غضبِ کردگار تھا
گر سامنے تھا شیر تو وہ بھی شکار تھا
تلوار کوندتی تھی فرس بے قرار تھا
مقتل میں گرم معرکۂ کارزار تھا
بہتا تھا خوں بدن سے تو منہ زرد ہوتے تھے
تلوار کی ہوا سے بدن سرد ہوتے تھے

تلوار کی تعریف

بجلی سی جس پرے کیطرف آکے پھر گئی
ناگن تھی اک کہ فوج پہ لہرا کے پھر گئی
دم میں لہو زمین پہ برسا کے پھر گئی
اللہ رے منہ صفوں کی صفیں کھا کے پھر گئی
کاٹے جگر تو اور دلیری ہوئی اُسے
سیروں لہو پیا پہ نہ سیری ہوئی اُسے

تیغیں کمر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ
سینے سپر کے ساتھ کٹے دل جگر کے ساتھ
ہل چل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ
اس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کے
روحیں روانہ ہو گئیں قالب کو چھوڑ کے

سر ہنگ شام ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے
جو بچ گئے ادھر سے اُدھر جا کے مر گئے
کتنے جواں سموں کے تلے آ کے مر گئے
پس پس کے سر بہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے
شبد یز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہلچل اِدھر اُدھر

فوجِ قاہرہ شکست کھا کر بھاگ جاتی ہے۔ حضرت عباس گھوڑا اڑا کر نہر میں داخل ہوتے ہیں۔ پانی کو دیکھ کر تشنہ لب گھوڑے کی جو حالت ہوتی ہے اسکی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

محاکات

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹنے میں بند بند
چمکارتے تھے حضرتِ عباس حق پسند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شورہ آبشار کا
گردن پھرا کے تکنے لگا منہ سوار کا

سقائے اہل بیت مشک بھر کر نہر سے باہر آتا ہے۔ اتنے میں ہزیمت خوردہ فوج پھر جمع ہو کر آپ کو نرغہ میں لے لیتی ہے۔ بزدل فوج اگرچہ ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ مگر پھر بھی نزدیک سے وار کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

نزدیک سے نہ کرتا تھا حربہ کوئی شریر
پہلو سے تیر چلتے تھے اور سامنے سے تیر
تھے ایک جانِ زار کے دشمن جوان و پیر
برچھے تھے گرد بیچ میں شہ کا مہِ منیر
منظور ظلم سخت تھا ہر بد خصال کو
پتھر شقی لگاتے تھے زہرا کے لال کو

اک تشنہ کام لاکھوں ہیں کس کس کو دے جواب
شل ہوگیا تھا بازوئے فرزند بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اٹھانے کی مجھ میں نہیں ہے تاب
لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضایع ہو مشک آب
پروانہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشکِ سکینہ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی
اک تیر سے ادھر کبھی چھیدے ادھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی
سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی

اسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں۔

تاثیرِ بیان

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی
ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زباں کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی
جھکتے تھے خود فرس سے کبھی انشاں کبھی
گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانوں میں داب کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

دونوں بازو شانوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ مگر شیر کی جرات میں فرق نہیں آتا۔

گو ہاتھ کٹ گئے تھے مگر کچھ نہ تھا ہراس
دانتوں سے جھک کے مشک کو پکڑا بصد ہراس

یہ رعب تھا کہ ڈر سے نہ آتا تھا کوئی پاس
غم تھا کہ گر پڑا علمِ شاہ حق شناس
آنکھیں لہو تھیں رخ سے جلال آشکار تھا
مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

چھاتی پہ نیزے رکھ کے انہیں روکتے تھے سب
ٹھکرا کے رہوار کو بڑھتے تھے واں سے جب
مارا کسی نے فرق پہ اک گرز ہے غضب
اس پر بھی بڑھ چلا تھا وہ بید ست تشنہ لب
صدمے سے زرد چہرۂ پر نور ہو گیا
ضربت لگی کہ کاسۂ سر چور ہو گیا

وہ کونسا ہے پھول جو برباد نہیں ہے
گلزارِ جہاں میں کوئی دل شاد نہیں ہے
بلبل کو بجز نالوں کے کچھ یاد نہیں ہے
قمری کی توجہ سوئے شمشاد نہیں ہے
گلشن میں خس و خار کا انبار عیاں ہے
شبنم کے عوض خون رگ گل سے رواں ہے

ہے دل میں کہ پھولوں کا لگا دیجیے انبار
لیکن شجرِ طبع میں آئے ہیں نئے بار
شرمائے جسے دیکھ کے فردوس کا گلزار
ان پھولوں سے گلدستۂ نو کیجیے تیار
آراستہ یوں کیجیے ہر اک گل تر سے
جنت میں نہ گذرا ہو فرشتوں کی نظر سے

صبحِ شہادت

مغرب کو کیا کوچ شب نیک سیر نے
جب تاج رکھا فرق پہ سلطانِ سحر نے
رخساروں کو شبنم سے بھگویا گلِ تر نے
ہاتھوں پہ لیا نور ریئے نذر قمر نے

جلوہ جو ہوا خسرو خاور کی ضیا کا
غل تحت سے تا فوق گیا صلِ علےٰ کا

حضرت امام حسین خیمہ کے باہر انصار و اعزہ کو لئے بیٹھے ہیں۔ خیمہ کے اندر بچے شدتِ تشنہ لبی سے بیتاب ہیں۔ لکھتے ہیں۔

بچوں کے جو رونے کی صدا آتی تھی باہر — ہر بار مصلّے پہ تڑپ جاتے تھے سرور

گریاں تھے دمِ سرد کبھی بھرتے تھے مولا — مڑ کر کبھی بھائی پہ نظر کرتے تھے مولا

اور

فرماتے تھے حضرت کہ نہیں صبر کا یارا — یہ کہتے تھے جینا نہیں خادم کو گوارا
پلٹے ہیں ادھر نہر سے پانی ستم آرا — ہو حکم تو ہم چھین لیں دریا کا کنارا
گھر میں شبِ ہفتم سے قیامت یہ بپا ہے
معصوم مرے جاتے ہیں مرجانے کی جا ہے

لشکرِ غنیم کی جانب سے تیر باری ہوتی ہے۔ اس وقت۔

کی عرض حبیب ابنِ مظاہر نے کہ آقا — تیر آ چکے اس سمت سے تاخیر ہے اب کیا
ہے آلِ نبی پر یورشِ لشکرِ اعدا — پائیں کہیں سرکش عوض اس بے ادبی کا
بپھرے ہیں جری لشکرِ اللہ و نبی کے
کیا دیر ہے کھلوائیے رایت کو علی کے

امام عالی جاہ تیاری جنگ کا حکم صادر فرماتے ہیں:۔

گھوڑوں پہ چڑھے شہ کے عزیز و رفقا سب — اللہ نے بخشا تھا انہیں صبر کا منصب

پیاسے تھے ہلائے نہ شکایت میں مگر لب سینے تھے ولائے شہِ والا سے لبالب
عاشق تھے دل وجاں سے ولی ابنِ ولی کے
کوثر پہ گئے ساتھ حسین ابنِ علی کے

تھے بیچ میں شہ گرد تھے یوں یاورواحباب جھرمٹ میں ستاروں کے ہو جس طرح سے مہتاب
تھے اُن میں کئی باغِ علی کے گلِ شاداب غصہ کی نگاہیں کہ جگر شیر کا ہو آب
زورِ اسداللہ سے بازو جو بھرے تھے
بل ابروؤں پہ ہاتھوں کو قبضوں پہ دھرے تھے

ایک ایک جوانمرد والوالعزم ونمودار جانبازِ شجاعت کے دہنی صفدر و جرار
مرنے کی خوشی طبع میں دل زیست سے بیزار ہو جنگ تو فوجوں کو بھگا دیں دمِ پیکار
خوفِ شہِ دیں سے سرِ عجز اُنکے جھکے تھے
شبیر کے روکے سے وہ جرار رکے تھے

پہنچے جو اڑاتے فرسوں کو وہ دلاور گھوڑے کی عناں روک کے ٹھیرے شہِ صفدر
برچھے کو ہر اک شیر نے گاڑا جو زمیں پر تھرائی زمیں کانپ گیا شام کا لشکر
گونجے جو اسد بیشۂ ضرغام اسد کے
رن بول اٹھا پاؤں ہٹے فوجِ حسد کے

ڈنکا ہوا لشکر میں بن سعد کے ناگاہ تیر آنے لگے فوجِ ستم سے طرف شاہ
نکلا صفِ دشمن سے حرِ صفدرِ ذی جاہ سر دینے کو آیا عوضِ ابنِ ید اللہ
آنکھیں جو ملیں سبطِ پیمبر کے قدم سے
جرم اُسکے بحل ہو گئے آقا کے کرم سے

جب عفو جرائم سے ہوئی اس کو فراغت
لی فاطمہ کے ماہ سے مرنے کی اجازت
پہنچا جو پئے جنگ سوئے فوج شقاوت
مارا کئی سرداروں کو اللہ رے جرات

مقتول جفا کشتۂ اول ہوا غازی
اللہ کے لشکر کا حراول ہوا غازی

مرنے گئے بعد انکے بریر ہمدانی
دہشت سے ستمگاروں کے زہرے ہوئے پانی
وہ زور وہ شیرانہ طبیعت، وہ جوانی
کچھ کثرت لشکر کی حقیقت بھی نہ جانی

لب تشنہ وہ کوثر کے کنارے گئے آخر
جب لاکھوں کو مارا تو وہ مارے گئے آخر

جب غیر عزیزوں کی طرح ہو گئے قربان
رخصت ہوئے شبیر سے مسلم کے دل و جان
کوفہ کے جفاکاروں کو مارا سر میدان
لڑ بھڑ کے ہزاروں سے وہ بچے ہوئے بیجان

چھوٹے تھے ہزاروں جو گل زخم بدن میں
دونوں کو اجل لے گئی جنت کے چمن میں

مارے گئے جب مسلم مظلوم کے دل بند
مقتل میں گئے شاہ کی ہمشیر کے دلبند
مارا انہیں چن چن کے جواں تھے جو تنومند
آخر ہوا تیغوں سے بدا شیروں کا ہر بند

بچے جو گرے خاک پہ گھوڑوں سے الٹ کے
روئے شہ دیں دونوں کی لاشوں سے لپٹ کے

حضرت قاسم بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ اس وقت حضرت عباس دفور رنج والم میں امام عالی جاہ سے عرض کرتے ہیں۔

وہ غم ہے کہ جس غم کو بشر سہہ نہیں سکتا
صدمہ ہے جو دل پر اسے میں کہہ نہیں سکتا

حیرت ہے کہ اشک آنکھ سے بھی بہہ نہیں سکتا بے سر دیئے عباس علی رہ نہیں سکتا

تا زیست نہ دل سے یہ الم جائے گا آقا

مر جاؤں گا جس وقت تو چین آئے گا آقا

مرنے کے ارادے پہ کمر باندھ چکے ہیں ہتھیار پئے فتح وظفر باندھ چکے ہیں

رہوار پہ زیں کس کے تبر باندھ چکے ہیں اعدا کے لئے تیغ وسپر باندھ چکے ہیں

نیرنگ اگر لاکھ یہ چرخِ بریں ہو

ہم قاتلِ قاسم کو نہ چھوڑیں گے کہیں ہو

پہلے تو حضرت نے کنکھیوں سے رخ عباس کو دیکھا۔ پھر مڑ کر حضرت زینب سے ارشاد کیا۔

ہم سمجھے تھے جو کچھ وہ مقدر نے نہ چاہا فرقت میں کرے صبر عطا بار الہٰا

بچپن میں زباں سے جو کہا تھا وہ نباہا طے ہو گئیں دنیا و عدم کا یہ دوراہا

نہ رنج سفر پھر ہے نہ ایذا و بلا ہے

منزل پہ پہنچ جائے مسافر تو مزا ہے

روکیں گے نہ ہم خیر یہ جائیں سوئے میداں سہہ لیں گے دلِ زار پہ تیغ غم ہجراں

ہر چند کہ مشکل ہے فراق جسد و جاں کیا کیجئے مجبور ہے ہر امر میں انساں

ہوگا وہ مقدر میں جو کچھ ہونا ہے زینب

مرنا ہے انہیں اور ہمیں رونا ہے زینب

اس وقت حضرت سکینہ وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ عباس غازی فرطِ محبت سے بھتیجی کو گود میں لے لیتے ہیں۔ حضرت سکینہ خشک لب دکھا کر کہتی ہیں۔

کیا قیامت ہے۔ کہ ؎

قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
سنتی ہوں کہ اس دشت میں پانی نہیں ملتا

حضرت عباس اس معصومانہ گفتگو سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

بولے یہ علمدار جری اشک بہاکر ہم نہر سے بھر لاتے ہیں پانی ابھی جاکر
اے جانِ عم اک مشک تو لے آؤ اٹھا کر تم باندھ دو پرچم میں عَلم کے اُسے لاکر
حسرت ہے جو دل میں وہ نکل جائے سکینہ
دنیا میں مرا نام ہو سقائے سکینہ

مشکیزہ جو لے آئی سکینہ جگر افگار غازی نے جھکایا علمِ احمد مختار
پرچم کے قریں باندھ کے تسمہ بدل زار کہنے لگی عباس سے وہ آئینہ رخسار
کب آؤ گے اتنا مجھے بتلا کے سدھارو
جلد آنے کی میداں سے قسم کھا کے سدھارو

آپ حضرت سکینہ کو دلاسہ دیتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں۔ ہم بہت جلد واپس آجائیں گے۔

روانگی حضرت عباس

رخصت ہوئے آداب بجالا کے علمدار مانندِ علی زینِ فرس پر ہوئے اسوار
تھم کر اُسے مہمیز جو کی آپ نے اک بار اللہ رے سرعت کہ ہوا ہو گیا رہوار
چالاک فرس لاکھ ہو ایسا نہیں چلتا
یوں سن سے ہوا کا کبھی جھونکا نہیں چلتا

آپ لشکرِ غنیم میں پہنچ کر اس طرح گرجتے ہیں:۔

ساذت کوئی ہو تو نکل کر ہمیں ٹوکے بالائے سپر تیغ کا اک وار تو روکے
ہاں صف سے بڑھے ہاتھ مگر جان سے دھوکے دشمن کو اٹھا لیتے ہیں نیزے میں پروکے
اُلٹیں گے پرے زورِ خدا ساز ہے ہم میں
حیدر کی لڑائی کا سب انداز ہے ہم میں

جد ہے مرا بو طالب والا سا دلاور بابا ہے شہِ عقدہ کشا فاتحِ خیبر
احمد کا وصی شیرِ خدا ساقیِ کوثر بندہ ہوں میں آقا ہیں مرے سبطِ پیمبر
عزت مجھے دی جاہ و حشم مجھ کو دیا ہے
اللہ کے لشکر کا علم مجھ کو دیا ہے

سقہ ہوں میں جس کا وہ کئی دن سے ہے بے آب اس غم میں ٹپکتا ہے مری چشم سے خونناب
روکے مرا رستہ کوئی کیا جان ہے کیا تاب یہ مشک کروں گا میں اسی نہر سے سیراب
بہ جائیگا جب خوں تو مقابل سے ہٹو گے
بے آبرو ہو گے جو نہ ساحل سے ہٹو گے

بڑھ کر یہ پکارا پسرِ سعد جفا کار یہ سچ ہے کہ ہیں آپ بڑے صفدر و جرار
ہیں لاکھ جواں تیغ بکف جنگ پہ تیار اس نہر پہ آجائے پرندہ یہ ہے دشوار
دوڑیں گے فرس اُنکے تو میدان ہلیگا
مقتل میں نشاں مشک و علم کا نہ ملیگا

سن کر سخنِ سخت بنِ سعد ستمگر مانندِ اسد غیظ میں جھوما وہ دلاور
غصہ میں غضب سرخ ہوا چہرۂ انور جھنجھلا کے کہا دور ہو آگے سے بداختر

ساونت ہیں لاکھوں سے کبھی ہم نہیں رکتے
روباہ ہوں بپھرے ہوئے ضیغم نہیں رکتے

تو کیا یہ زرہ پوش ہیں کیا او ستم ایجاد تو ڑیں ابھی گر سامنے ہو قلعۂ فولاد
یہ کور نمک جمع ہیں او بانیٔ بے داد دیکھ اب کوئی دم میں انہیں ہم کرتے ہیں برباد
اس تیغ سے دم لیں وہ گھڑی بھی نہ ملے گی
ڈھونڈھے گا تو زرہوں کی کڑی بھی نہ ملے گی

سن کر سخن حضرت عباس علمدار لرزاں ہوئے دل کانپ گئے فوج کے جرار
ہلچل ہوئی یوں لشکرِ نااہل میں اکبار جس طرح سمندر میں تلاطم ہو نمودار
تھا شور کہ دریا کو سمٹتے نہیں دیکھا
یوں فوج کو بڑھ کر کبھی ہٹتے نہیں دیکھا

رزمیہ

پیدا ہوئی ناگہ دہلِ جنگ کی آواز گھوڑوں کو بڑھانے لگے لشکر سبھی فسوں ساز
غول اپنا الگ باندھ کے ٹھیرے قدر انداز چلّوں سے چھٹے تیر لڑائی ہوئی آغاز
آمادۂ شر دیکھ کے فوجِ جہلا کو
غیظ آگیا فرزندِ شہِ قلعہ کشا کو

غازی نے ادھر میان سے لی تیغِ شرربار چمکا جو ذرا بیچ میں تھا فوج کے رہوار
لشکر کے نمو داروں سے چلنے لگی تلوار سرداروں کے سر کٹ کے ہوا کھیت میں انبار
لاشے تھے طپاں ہاتھ تھے نہ جسم پہ سر تھے
نخلِ قدِ اعدا میں نہ پتّے نہ ثمر تھے

تلوار کی تعریف

جرار کی تلوار نہ رکتی تھی کہیں پر سینے سے نکلتی تھی جو پڑتی تھی جبیں پر
سر کاٹ کے آجاتی تھی جب خانۂ زیں پر گر پڑتا تھا راکب مع رہوار زمیں پر
غل فوج میں تھا ضرب خداداد یہی ہے
ہنگامہ بپا تھا کہ یہ افتاد یہی ہے

گھوڑے کی تعریف

کرار کا وہ ہاتھ وہ شمشیرِ شرربار رخش ایسا کہ تھے جس میں انا البرق کے اطوار
اُڑ جاتا تھا مڑ جاتا تھا پھر جاتا تھا ہر بار اس پار کبھی فوج کے تھا اور کبھی اس پار
دل پستے تھے سرعت پہ سوارانِ عرب کے
یوں تیغوں کے نیچے سے نکل جاتا ہے دب کے
ابلی ہوئی وہ انکھڑیاں غصہ کی وہ چتون پتلی تھی ہر اک حور کی پتلی سے بھی روشن
پاکھر تھی کہ پہنے ہوئے تھا رخش بھی جوشن سُم بدر سے افزوں مہِ نو چاند سی گردن
راکب کو دکھاتا تھا چلن کبکِ دری کا
سرعت تھی کہ جھونکا تھا نسیمِ سحری کا
ہر سمت نمودار جواں بھاگ رہے تھے نانی تھے پہ رکھ رکھ کے نشاں بھاگ رہے تھے
پاتے تھے نہ مقتل میں اماں بھاگ رہے تھے آفت سے بچائے ہوئے جاں بھاگ رہے تھے
تھی تیغ علم زیست نے منہ پھیر لیا تھا
اک آگ نے سب شامیوں کو گھیر لیا تھا
گھونگھٹ ستم ایجاد کے لشکر نے جو کھایا خیمے سے بن سعد تڑپ کر نکل آیا

تھا چتر مغرق کا سر نحس پہ سایا ڈھالوں سے رفیقوں کی سیہ ابر تھا چھایا
غصہ سے جفا کار کی پیشانی پہ بل تھے
ہمراہ شقی کے کئی سو فوج کے یل تھے

خیمے سے بڑھا چند قدم جب وہ ستمگر غل فوج میں اٹھا کہ رئیس آگیا باہر
جو جو کہ صفیں ہوگئی تھیں خوف سے ابتر ڈنکا ہوا اسوار بڑھے جم گیا لشکر
تھرانے لگے دل عربی باجوں کے غل سے
مقتل کی زمیں ہل گئی آوازِ دہل سے

ایک پہلوان صفِ لشکر سے آگے بڑھ کر ابنِ سعد سے اذنِ جنگ طلب کرتا ہے۔ اجازت مل جاتی ہے۔ پہلوان عرض کرتا ہے۔

اب دیکھیں حضور آپ لڑائی کا تماشا بے سر کئے یہ جنگ ہٹوں گا نہ میں حاشا
دم بھر میں نظر آئیگا عباس کا لاشا یہ کہہ کے وہیں تیغ سے ترکش کو تراشا
سودا تھا شجاعت کا ستمگار کے سر میں
شانے پہ کماں باندھ لی تلوار کمر میں

گھوڑے کو مہمیز کر کے حضرت عباس کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔ دونوں حریفوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں پہلوان وار کرتا ہے۔ حضرت عباس وار خالی دیتے ہیں۔

پہلا ستم ایجاد کا خالی جو گیا وار ہونٹوں کو چبانے لگا غصہ میں وہ غدار
برچھا لیا وہ سرکش و سرہنگ نے یکبار ہو جسکی انی تختۂ فولاد کے اس پار
شرماتی تھی بجلی بھی سناں میں وہ چمک تھی

اژدر کی وہ تھی لہر کہ نیزے کی لچک تھی

نیزے کو ادھر لے کے بڑھا شیر کا فرزند چوٹیں ہوئیں دو چار چلے وار کھلے بند
صفدر کو ہنر اپنے دکھاتا تھا وہ ہر چند مہلت نہ مگر دیتا تھا حیدر کا جگر بند
بھالے پہ جو برچھی کی انی پڑ گئی رن سے
بیکار ہوا ڈانڈ سناں اڑ گئی سن سے

اس طرح کی خفّت سے ہوا تنگ جو ناری مردود نے لب اپنے چبائے کئی باری
بل کھا کے کماں دوش سے ظالم نے اتاری چلّے میں رکھا تیر بھی بدکیش نے بھاری
جرار نے نیزے کو تکاں دی جو بڑھا کر
دو تیر کے پلے پہ کماں گر پڑی جا کر

مل کر کف افسوس تبر اس نے اٹھایا غصّے سے ادھر شیر کے ابرو پہ بل آیا
تلوار علم کر کے جو گھوڑے کو بڑھایا مانند اسد ساعد ظالم کو دبایا
شہ زوری سے بل کرتا تھا نادان اسی کس پر
پنجہ سے تبر چھٹ کے گرا زین فرس پر

جرار نے پھینکا جو تبر خانۂ زیں سے دھڑ سے وہ گرا یوں کہ اڑی خاک زمیں سے
فرمایا یہ تن کر پسر سعد لعیں سے قوت کو مری پوچھ لے اس صاحب کیں سے
ڈوبا ہے عرق میں تو خجالت کا نشاں ہے
پاس اسکے کمند اب نہ تبر ہے نہ کماں ہے

یہ کہتا تھا غازی کہ بڑھا واں سے ستمگار جرار پہ سرکش نے کیا گرز کا اک وار
تھی دست مبارک میں علم تیغ شرربار چمکا کے نگادر کو جو ماری اُسے تلوار

حیرت تھی اُسے جنگ کے نظارے میں جو تھا
اک ضرب میں بیاں گرز گراں پیچ سے دو تھا

ساقی نامہ

اے ساقئ مہوش مئے سر جوش پلا دے
اے پیر مغاں جلوۂ مستانہ دکھا دے
ہاں شیشۂ لبریز کو ہونٹوں سے ملا دے
آئینۂ خاطر کو نئے سر سے جلا دے
تر ہو گا جو دل باغ مضامین کھلے گا
ہاں اس کا صلہ ساقئ کوثر سے ملیگا

آیا جو کئی بار وہ گرما کے تگا در
فرمایا عبث ڈرتا ہے بڑھ تیغ اٹھا کر
تلوار کھینچے پر یہ تعلّی ہے ستمگر
ہم پیاسے ہیں دو روز سے اور ہو ہے سیر
سیراب ہے اور جنگ کی قوت نہیں تجھ میں
ظاہر ہوا کچھ جرأت و ہمت نہیں تجھ میں

زخمی ہوا شمشیر زباں سے جو وہ غدار
کھینچے ہوئے تلوار کو آیا سوئے جرار
عباس دلاور بھی بڑھے چھیڑ کے رہوار
اٹھیں سپریں ہاتھوں میں یہ دھونے لگے وار
تیغوں کی چکا چاک نئی زیر فلک تھی
دو بجلیوں کی فوج کے بادل میں چمک تھی

زورِ بیان

بجلی سے وہ رہوار وہ تلواروں کی چھنکار
مڑنے پہ وہ موجود یہ اوڑ جانے پہ تیار
وہ آہوئے صحرا تو یہ صرصر سے بھی طرار
وہ شوخ یہ رفرف سے زیادہ کہیں جاندار
گرمی سے عرق میں ہمہ تن غرق تھے دونوں

تھے ابر کہیں اور کہیں برق تھے دونوں

تیغے کا جو اک ہاتھ ستمگار نے مارا روکر کے سپر پر اُسے غازی نے پکارا
رکتا نہیں دشمن سے کبھی ہاتھ ہمارا ہاں روک مری ضرب کو اب او ستم آرا
یہ کہہ کے کیا وار جو زور تیغ کی پاکر
سفاک کا سر دھڑ سے گرا نہر میں جاکر

پہلوان کا یہ المناک حشر دیکھ کر دریا کے نگہبان بھاگ جاتے ہیں۔ آپ گھوڑا اڑا کر فرات میں داخل ہوتے ہیں مشکیزہ سیراب کرتے ہیں۔

جب بھر چکا مشکیزہ کو پانی سے وہ صفدر منہ باندھ کے تسمے سے رکھا زینِ فرس پر
دو گام چلے تھے کہ بڑھا شام کا لشکر مینہ پڑنے لگا تیروں کا غازی پہ برابر
غل تھا کہ یہ جانباز ادھر آنے نہ پائے
ہاں شیر ترائی سے نکل جانے نہ پائے

ٹھکرا کے بڑھا دیتے ہیں ساحل سے جو رہوار جا پڑ جاتی ہے تلوار پہ تلوار
آجاتی ہے جب سامنے سے تیروں کی بوچھاڑ مشکیزہ کو سینے سے چھپا لیتا ہے جرار
ڈر ہے کوئی تیر آ کے نہ مشکیزہ پہ پڑ جائے
تقدیر نہ پیاسوں کی کہیں بن کے بگڑ جائے

پڑتے ہیں بدن پر جو سنان و تبر و تیر مانند اسد جھومتا ہے بازوئے شبیر
دم رکتا ہے ہوتی ہے اجل آ کے گلوگیر چھٹ جاتا ہے جب تھامتے ہیں قبضۂ شمشیر
زخموں سے ٹپکتا ہے لہو خانۂ زیں پر
ہے شور کہ اب گرتے ہیں عباس زمیں پر

جس سمت نکل جاتے ہیں گھوڑے کو دبا کر سو برچھیاں چل جاتی ہیں اک سینے پہ آکر
تھم جاتے ہیں اک صف جو پیادوں کی بھگا کر صف دوسری جم جاتی ہے تیغوں کو اٹھا کر
رستے ہیں رکے سر پہ اجل آئی ہوئی ہے
اک پیاسے پہ فوجوں کی گھٹا چھائی ہوئی ہے

کس کس سے لڑیں کس کو بھگائیں کسے روکیں دشمن وہ کہ پائیں تو سناں سینے میں بھونکیں
سب مل کے لڑیں صف میں اگر ایک کو ٹوکیں جس سمت پھریں تیغیں ہیں اور تیروں کی نوکیں
دم لینے کی مہلت کہیں زنہار نہیں ہے
تن چور ہے اب طاقتِ پیکار نہیں ہے

مارا کسی ظالم نے تبرزیں سے اٹھا کر ہیہات گرا دستِ یمیں کٹ کے زمیں پر
ضرب اور ستمگر نے جو کی آ کے برابر وہ ہاتھ بھی شانے سے کٹا وائے مقدر
سینے پہ کئی تیر لگے سن سے جو آ کے
رہوار پہ غش ہو گئے گردن کو جھکا کے

اک گرز گراں سر پہ برقہ نے جو مارا شق ہو گیا سر ابن ید اللہ کا سارا
تیورا کے گرا خاک پہ وہ عرش کا تارا خوش ہو کے یہ تب شمرِ ستمگار پکارا
لب تشنہ ہی کوثر کے کنارے گئے عباس
کہہ دے کوئی حضرت سے کہ مارے گئے عباس

میر انیس

جاتا ہے بازوئے شہِ دیں رزم گاہ میں
مرنے کا اشتیاق ہے خالق کی راہ میں
ہے عرض یہ جنابِ شہِ دیں پناہ میں
فوجِ ستم سماتی نہیں کچھ نگاہ میں
یہ جاں نثار آپ کا جس وقت جا پڑا
دیکھیں گے پھر حضور کہ کیسا معرکہ پڑا

خویش و اقارب سے رخصت ہو کر حضرت عباس علی میدانِ جنگ کو روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی

پڑھنے رجزدہ دل و جانِ مرتضےٰ
تھرائے قلب کانپ گیا دشتِ کربلا
کالے علم صفوں میں کھلے چھاگئی گھٹا
باجے بجے یزید کے لشکر میں جا بجا
واں کے جواں بھی شور رجز پڑھتے آتے تھے
عباس تیغ تولے ہوئے بڑھتے جاتے تھے

ناگاہ تیر آئے علمدار کی طرف
لشکر بڑھا حسین کے غمخوار کی طرف
بدلی جو آئی ظلم کی جرار کی طرف
دیکھا جری نے غیظ سے تلوار کی طرف
دم بھر نہ پھر میانِ نیام اس کو کل پڑی
گویا تڑپ کے ابر سے بجلی نکل پڑی

زورِ بیان

ناوک چلے تو شیر نے تولا حسام کو
آیا جلال بازوئے مشارِ انام کو

جلوہ دیا جو تیغِ ظفر احتشام کو　　دم میں اجل نے گھیر لیا فوجِ شام کو
بڑھنا تھا تیغ کا کہ لہو تن سے گھٹ گئے
ڈھالوں کو منہ پہ لے کے سیہ کار ہٹ گئے

تلوار کی تعریف

جس غول پر وہ برقِ اجل رن میں چل گئی　　رنگت سپاہ شام کی فوراً بدل گئی
بجلی سی فوجِ کیں پہ گری اور نکل گئی　　جس صف کو آنچ لگ گئی اسکی وہ جل گئی
شعلوں سے اُس کے چار طرف ابتری ہوئی
گویا تھی آبِ تیغ میں آتش بھری ہوئی
آئی چمک کے سر پہ تو ابرو کو دو کیا　　ابرو کو کاٹ کر جو بڑھی رو کو دو کیا
ترچھی چلی ادھر سے تو پہلو کو دو کیا　　گہ دل اڑا کے سینۂ بدخو کو دو کیا
واں سے بڑھی جو تیغ تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں
جس پر چمک کے آئی وہ صف پائمال تھی　　تلواریں کٹ گئی تھیں عجب چال ڈھال تھی
شفاف تھی کبھی تو کبھی خوں سے لال تھی　　ڈھالوں کے ابر میں کبھی شکلِ ہلال تھی
دم میں وہ سرد تھا جسے اس کی ہوا لگی
خوں پی کے چھوڑا جس کے گلے سے وہ جا لگی
مانند برقِ تیغ دو دم بے قرار تھی　　آفت کی بارہ تھی تو قیامت کی دہار تھی
اس غول میں کبھی کبھی اس صف کے پار تھی　　بادِ سموم تھی، غضبِ کردگار تھی
منہ کٹ گئے تھے لشکریوں کا یہ حال تھا

یاں تیغ آبدار کا چہرہ بحال تھا

ایک پہلواں ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا مقابلے کے لئے بڑھتا ہے۔

آتے ہی:۔

نعرہ کیا شقی نے کہ اے مرتضیٰ کے لال　　میں جانتا ہوں دیو کو پشہ دم جدال
صفدر ہوں کانپتے ہیں مری ضرب سے جبال　　سر بر ہو مجھ سے جنگ میں کوئی یہ کیا مجال
رن پر چڑھا میں جب تو یہ قصہ تمام ہے
تلوار کا دھنی ہوں بڑا میرا نام ہے

بولے یہ تیغ تول کے عباس نیک نام　　تو کیا ہے اور وغا تری کیا اور کیا حسام
ظالم غرور و کبر کے لازم نہیں کلام　　کھل جائیں گے نبرد میں تیرے ہنر تمام
ہم سے لڑے گا او سگِ بزدل خدا کی شان
نامرد مرد کے ہو مقابل خدا کی شان

یہ سن کے آگ ہو گیا وہ بانیٔ ستم　　نیزہ اٹھا کے تیز کیا اسپ تیز دم
سنبھلے فرس پہ حضرتِ عباس ذی حشم　　آئی سناں قریب تو کی تیغ سے قلم
کھینچا پکڑ کے ڈانڈ تو جھٹکا بڑا پڑا
منہ گردن فرس پہ ستمگر کا جا پڑا

پھر تیغِ تیز میان سے لیکر وہ نابکار　　آیا غضب میں سوئے علمدار نامدار
بولا کہ اے دلیر خبردار و ہوشیار　　خالی نہ جائے گا کہ غضب کا ہے میرا وار
عالم کے سرکشوں سے یہ گردن جھکی نہیں
تو کیا ہے دیو سے مری ضربت رکی نہیں

چمکی سرِ جری پہ جو شمشیر بد گہر
عباس نامدار نے لی دوش سے سپر
ظالم نے ضرب کی تو گری تیغ ٹوٹ کر
بولے یہ مسکرا کے علمدار نامور
کہتا تھا تو ابھی کہ قوی تر ہوں گیو سے
کیوں ضرب تھی یہی جو نہ رکتی تھی دیو سے

لے اب ہمارے وار کو روک او زبوں شعار
گرتی ہے تیرے سر پہ شمشیر آبدار
سنبھلا ادھر فرس پہ شقی بہرِ کارزار
آپہنچے تیغ تول کے عباس نامدار
گھوڑا جھجک کے اس کا ادہر کو جو پھر پڑا
مارا بس ایک ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

اس کے بعد آپ عازمِ دریا ہوتے ہیں۔ نگہبان چوکیاں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں :۔

محاکات

دیکھا جو شیر نے کہ گریزاں ہیں اہلِ شر
آئے اڑا کے اسپ سبک رو کو نہر پر
ٹھنڈی ہوا جو آئی تو ٹکڑے ہوا جگر
آیا خیالِ تشنگیٔ شاہِ بحر و بر
جب ایسا باوفا ہو تو کیا دل کو کل پڑے
منہ کو کلیجہ آگیا آنسو نکل پڑے

پانی سے ہیں قریب جو عباس نامدار
اس آب میں اترنے کو گھوڑا تھا بیقرار
دیکھی جو دور دور سپاہِ ستم شعار
داخل ہوا فرات میں وہ شیر ایک بار
قبضہ کیا ترائی پہ دم میں دلیر نے
مشکیزہ بھر کے رکھ لیا کاندھے پہ شیر نے

ساحل سے نکلے آپ یہ کرتے ہوئے دعا یارب ستم کے تیروں سے اِس مشک کو بچا
بچے تڑپ رہے ہیں حرم کرتے ہیں بکا دو دن ہوئے کہ لب نہیں پانی سے آشنا
خورسند مجھ سے فاطمہ کا نورِ عین ہو
پہنچے یہ آب خیمۂ شہ میں تو چین ہو

جلدی بڑھا یہ کہہ کے بہادر سوئے خیام دیکھا کہ مثلِ قلعہ ہے ہر سو سپاہِ شام
لشکر سے کر رہا ہے یہ شمرِ لعیں کلام برساؤ تیرِ ظلم یہ قصہ کرو تمام
تصویر بھر دو خون میں اس تشنہ کام کی
توڑو کمر حسینؑ علیہ السلام کی

لڑائی میں آپکے دونوں بازو کٹ جاتے ہیں مگر جرأت و شجاعت میں فرق نہیں آتا

سقائے اہلِ بیت کی جرأت پہ ہیں فدا دانتوں سے جھک کے مشک کا تسمہ پکڑ لیا
ہر سمت سے برسنے لگے ناوکِ جفا لکھا ہے راویوں نے کہ مشکیزہ چھد گیا
مجبور جب بشر ہو تو کیا چین پھر پڑے
پانی کو بہتے دیکھ کے گھوڑے سے گر پڑے

✻

اے رخشِ قلم سرعتِ اعجاز دکھا دے رفرف سے فزوں قوتِ پرواز دکھا دے
مضمارِ فصاحت میں تگ و تاز دکھا دے بجلی بھی تڑپ جائے وہ انداز دکھا دے
ایسی دمِ رفتار روانی نظر آئے
پتھر کی زمیں بھی ہو تو پانی نظر آئے

جب وارِدِ صحرائے مصیبت ہوئے شبیر جنگل میں گرفتارِ اذیت ہوئے شبیر

سلہ "علیہ السلام" کا بے محل استعمال صحت مذاق کے منافی ہے

تھا شور کہ آوارۂ غربت ہوئے شبیر محبوس غم و درد و صعوبت ہوئے شبیر
افسوس مسافر کو نہ آرام ملے گا
بے کس کو نیا غم سحر و شام ملے گا

آل رسول کی پریشان حالی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔

افسوس کہ عالم سے خوشی ہو گئی نایاب ہیں جمع یہاں رنج و مصیبت کے سب اسباب
گذریں گے کئی روز انہیں بےخور و بےخواب بے آبی سے مرجھائے گا یہ گلشن شاداب
چھوڑیں گے نہ باغی کبھی بستانِ نبی کو
لوٹے گی خزاں گلشنِ زہرا و علی کو

واقعات

دریا کے اترنے پہ جو ہونے لگی تکرار برہم ہوئے شبیر کے انصار خوش اطوار
غصہ سے لگے کانپنے عباس علمدار چہرے سے عیاں تھا غضب حیدرِ کرار
تھی شیر کی غصہ سے نظر فوجِ ستم پر
تھا دستِ جری قبضۂ شمشیر دودم پر

بڑھ بڑھ کے یہی کہتا تھا اعدا سے وہ صفدر دیکھیں تو ہٹاتا ہے ہمیں کون سا لشکر
بودے نہیں کچھ یاورِ فرزند پیمبر تب جانیں جب آئے کوئی تلوار کے منہ پر
ہم نے سرِ ساحل یہ علم گاڑ دیا ہے
شیروں نے ترائی میں قدم گاڑ دیا ہے

نزدیک تھا کہ گھاٹ پر تلوار چل جائے۔ مگر یہ شور و غل سنتے ہی امام عالیجاہ موقع پر پہنچکر حضرت عباس کو لڑائی سے منع کر دیتے ہیں۔ اور خیام

حرم ریتی پر بپا ہوتے ہیں۔

کیا قہر ہے ہاتھوں سے گیا پیاسوں کے دریا میدان کفِ دست میں خیمے ہوئے برپا
اکدم بھی شب و روز میں راحت تھی نہ اصلا تھی آٹھ پہر دھوپ کی اور پیاس کی ایذا
گرمی کی وہ شدّت تھی کہ جی کھوتے تھے بچّے
پانی کے لئے اشکوں سی منہ دھوتے تھے بچّے

دو دن تو غریبوں نے بہر طور گذارے معصوم ہوئے جاتے تھی سب پیاس کے مارے
ریتی پہ پڑے لوٹتے تھے عرش کے تارے پہرے تھے ستمگاروں کے دریا کے کنارے
کچھ بن نہیں آتی شہِ آوارہ وطن کو
کس یاس سے تکتے ہیں ہر اک تشنہ دہن کو

گہوارے میں دم توڑتا تھا اصغرِ معصوم بچّے کے لئے بیٹھی تھی بانوئے مغموم
خاموش تھے اس غم میں مگر سیّدِ مظلوم فرماتے تھے ہر بار کہ جو خواہشِ مقسوم
معصوم کی تکلیف گوارا نہیں بانو
تقدیر سے پر زور ہمارا نہیں بانو

شب صبحِ شہادت

تھی صاف غریبوں کو قیامت کی سحر رات رونے میں تڑپنے میں کٹی چار پہر رات
کی قبلۂ عالم نے صعوبت میں بسر رات آنے لگی جب وقت بہت تھوڑی نظر آتی
آمادہ ہوئے مرگ پہ انصارِ حسینی
کہنے لگے کمردں کو مددگارِ حسینی

صبح کے نمودار ہوتے ہی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ انصار امام دادِ مردانگی

دے کر شہید ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

فردوس کو جس وقت وہ ابرار سدھارے
غل پڑ گیا حضرت کے مددگار سدھارے
فرماتے تھے شبیر وفادار سدھارے
ساتھی مرے مونس مرے غمخوار سدھارے

باقی نہ رہا جاہ و حشم فوجِ خدا کا
افسانہ مگر رہ گیا اُن سب کی وفا کا

حضرت علی اکبر اور حضرت عباس کے سوا باقی اعزہ بھی جنگ میں کام آتے ہیں۔ حرم میں معصوم بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ گھر بھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ لشکرِ غنیم کی طرف سے ہل من مبارز کی متواتر صدائیں آرہی ہیں۔ اس وقت سقائے نامدار مشکِ سکینہ اور علم لے کر میدانِ کارزار کی طرف بڑھتا ہے۔ آپ کی رجز خوانی سے لشکرِ شام کے بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔

اللہ ری رجز خوانیٔ عباس علمدار
ہاتھوں سے دلیروں کے گرے پڑتے تھے ہتھیار
نعرہ ہے کہ بڑھ کر ہمیں روکے کوئی جرار
ہم آتے ہیں ہاں نہر سے اور گھاٹ سے ہشیار

تلواروں سے تیروں سے بہادر نہیں رکتے
روباہوں کے روکے سے غضنفر نہیں رکتے

کیا مُنہ ہے اٹھائے جو مرے سامنے سر شیر
یہ آنکھ ہے وہ جس سے چراتا ہے نظر شیر
کس طرح نہ ہو شیر وہ جس کا ہو پدر شیر
دنیا میں ہُوا کرتے ہیں شیروں کے پسر شیر

آگاہ نہیں کیا پسرِ شیرِ خدا ہوں
ہیں وارثِ شمشیر شہ قلعہ کشا ہوں

جنگ شروع ہوتی ہے۔ اور اہلِ شام حضرت عباس کی تلوار

کا لوہا مان جاتے ہیں۔

غل چار طرف تھا یہی افواجِ ستم میں اس شیر سے سر بر ہوں یہ طاقت نہیں ہم میں
دیکھو تو برش قہر کی ہے تیغِ دو دم میں نیزوں کے نیستاں کو قلم کر گئی دم میں
چھپتی ہیں پسِ پشت جو ڈھالیں تو بجا ہے
تلوار نہ سمجھو اسے یہ قہرِ خدا ہے

میدان سے جب بھاگ گئی فوجِ ستمگار چمکار کے بس روک لیا غازی نے رہوار
خوں پونچھ کے رکھی تہِ راں شیر نے تلوار مانندِ اسد رن میں ٹہلنے لگا جرار
باقی تھے نہ دم خوف سے اس تیغِ دو دم کے
پھرے اُٹھے دریا سے بھی سب فوجِ ستم کے

دم لے کے بڑھا واں سے جو حضرت کا فدائی اتنے میں نظر آگئی دریا کی ترائی
مسرور ہوئے آپ کہ امید بر آئی پر ساتھ ہی پیاسوں کیلئے چشم بھر آئی
پہلو میں جگر تشنگیٔ شاہ سے شق تھا
اصغر کا قلق پیاسی سکینہ کا قلق تھا

دریا پہ جو خورشیدِ نجف کا قمر آیا اک نور کا جلوہ سرِ ساحل نظر آیا
تھا شور کہ بازوئے شہِ بحر و بر آیا یہ سن کے ہر اک مردمِ آبی ابھر آیا
کہتے تھے فدا شوکتِ سقائے حرم کے
آنکھوں پہ ہماری قدم اس بحرِ کرم کے

اندازِ بیان

داخل ہوا جب نہر میں وہ شیرِ دلاور بس دوڑ کے سر رکھ دیا موجوں نے قدم پہ

پاؤں پہ حبابوں نے بھی آنکھیں ملیں جھک کر — جس وقت پڑا پانی میں عکس رخ انور
اک نور کا جلوا ہوا گرداب کے اندر
آتا تھا نظر اُن کو قمر آب کے اندر

بے چین کئے دیتی تھی گو تشنہ دہانی — بے شہ کے گوارا نہ ہوئی پیاس بجھانی
رہوار سے خم ہو کے بھرا مشک میں پانی — پیاسا رہا دریا پہ یداللہ کا جانی
یہ عشق تھا عباس کو شاہِ شہدا کا
افسانہ ہے عالم میں بہشتی کی وفا کا

آپ اس طرف مشک بھرنے میں مصروف ہیں۔ ادھر افسرانِ فوج سپاہیوں کی ہمت بڑھا بڑھا کر انہیں جنگ کی ترغیب دیتے ہیں،۔

سن سن کے کلام عمرو شمرِ بد اختر — دوڑے صفتِ غول بیاباں وہ ستمگر
بھاگی ہوئی پھر جمع ہوئی فوج سمٹ کر — لو گھر گئے خونخواروں میں عباس دلاور
تیغوں کو علم سینکڑوں سفاک کئے تھے
اک پیاسے کو حلقے میں کماندار لئے تھے

پلے سے لگاتے تھے کھڑے تیر جفا کیش — لچکاتے تھے نیزوں کو قریب آکے بد اندیش
تلواریں چمکتی تھیں چپ و راست و پس و پیش — لڑتا تھا ہزاروں سے اکیلا یہ جگر ریش
حربوں سے جفا کاروں کے مہلت نہیں ملتی
غازی کو نکل جانے کی فرصت نہیں ملتی

کس کس سے لڑیں یہ کسے روکیں کسے ٹالیں — گھوڑے کو اس انبوہ سے کس طرح نکالیں
زخمی کئے دیتی ہیں جگر نیزوں کی بھالیں — خود سنبھلیں یہ اب یا علم و مشک سنبھالیں

تلواریں برستی ہیں یہ جاتے ہیں جدہر کو
جس پر کہ یہ آفت ہو وہ اب جائے کدہر کو
تیروں کی جو ہر سمت سے پڑنے لگی بوچھاڑ گھبرا گئے یہ دیکھ کے عباس علمدار
تیغ و تبر و تیر و سناں کھاتا تھا جرار جھک جھک مگر مشک بچاتا تھا وفادار
سینہ سے نہ مشکیزہ جدا کرتا تھا غازی
پانی کے لئے جان فدا کرتا تھا غازی
دو سمت سے تیغیں جو چلیں شانوں پہ اکبار شانوں سے جدا ہو کے گرے دست علمدار
اتنے میں ہوا تیر ستم مشک سے بھی پار ہر نے پہ سر اس غم سے ٹپکنے لگا جرار
غش کھا کے گرا گھوڑے سے سقائے سکینہ
اور دل سے صدا آنے لگی ہائے سکینہ

حضرت وحید

اے قلم دامن کاغذ یہ گہر ریز ہو پھر اے سخن منتظم نظم دلآویز ہو پھر
اے خرد غیرت شبدیز سبک خیز ہو پھر اے زباں صورت شمشیر علی تیز ہو پھر
ڈھنگ ضرب اسد حق کا نظر آ جائے
معرکہ خیبر و خندق کا نظر آ جائے

حضرت عباس امام عالی جاہ سے اذن جنگ لیکر خیمہ میں اس غرض سے داخل ہوتے ہیں۔ کہ حضرت زینب سے بھی رضائے شہادت حاصل کریں۔ آپ

بات پر کہ امام عالی جاہ نے انہیں رخصت جنگ عنایت فرمادی ہے۔ حضرت زینب نے ارشاد فرمایا۔

میں نہ مانوں کہ جدائی انہیں ہوگی منظور
دیکھ کر جسکو جئیں اسکو کریں آنکھ سے دور
تم نے اس امر میں اصرار کیا ہوگا ضرور
اپنا دل تھام کے وہ رہ گئے ہونگے مجبور
پھیر و الفت کی نظر تم سے تعجب ہے مجھے
وہ تو صابر ہے مگر تم سے تعجب ہے مجھے

تم سا عاشق ہو اس آفت میں برادر سے جُدا
کیا غضب ہے کہ لہو ہو دلِ مضطر سے جدا
قہر ہے گر ہو ضیا مہرِ منور سے جدا
یہ بھی ہوتا ہے کہ بلبل ہو گلِ تر سے جدا
دل بدل جائے یقیں مجھ کو کسی طور نہیں
تم وہی چاہنے والے ہو کوئی اور نہیں

عباس غازی جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

شاد ہے مار کے دولہا کو بہت لشکرِ شام
طعنہ زن ہو کے کئی بار لیا ہے مرا نام
آشنا کان نہ تھے جن سے سنے ہیں وہ کلام
غیظ سے کانپ رہا ہوں کہ علی کا ہوں غلام
ایسے ہنگام میں بے جنگ گذارا ہی نہیں
میں نہیں یا یہ گروہِ ستم آرا ہی نہیں

تشنگی سے ہیں ادھر بچوں کی روحیں تحلیل
پیاس اس قہر کی یہ گرمیاں عمریں قلیل
حال یہ دیکھ کے ہے اور زیادہ تعجیل
نہر تک جاؤں تو پانی کی بھی کچھ نکلے سبیل
کانٹے کم ہوں دہنوں کے تو ٹھہر جائیں کہیں
خوف ہے پھول سے معصوم نہ مرجائیں کہیں

یہ سن کر بنت علی فرماتی ہیں۔

میں تو واقف ہوں کہ حس دم نہیں آتا ہے جلال — خوف لاکھوں کا نہ کچھ جان کا رہتا ہے خیال
گریہ نوبت ہو کہ ہونے لگے اعدا سے جدال — دل دھڑ کتا ہے کہ کیا جانئے پھر کیا ہو مآل
حق نہ دکھلائے یہ غم فاطمہ کے جانی کو
تم پہ آنچ آئی تو پھر آگ لگے پانی کو

حضرت عباس یہ کہہ کر حضرت زینب کی تسلی کر دیتے ہیں کہ یہ مجمع روباہ ایک شیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اہلِ حرم کو پانی سے سیراب کر دوں گا۔ اس کے بعد

کر کے تسلیم دلاور ہوا گھوڑے پہ سوار — بازوئے سبطِ پیمبر ہوا گھوڑے پہ سوار
رن پہ چڑھنے کو غضنفر ہوا گھوڑے پہ سوار — کہتے ہی اللہ اکبر ہوا گھوڑے پہ سوار
عزم کچھ اور تو چتون کا بھی ڈھنگ اور ہوا
ولولہ میں رخِ پُر نور کا رنگ اور ہوا

پیکِ تیز رفتار لشکرِ شام میں یہ خبر لیکر پہنچتے ہیں کہ ع
آ گئے حضرتِ عباس علی بہرِ وغا

یہ خبر سنتے ہی گھبرا گئے لشکر کے جواں — انگلیاں اٹھنے لگیں سب ہوئے باہم نگراں
کوئی کہتا تھا کہ وہ ہے تیغ گردعیاں — کوئی کہتا تھا وہ دیکھو نظر آتا ہے نشاں
وہ پھریرا ہے بلندی پہ جو لہراتا ہے
پنجہ بجلی سا وہ ہر بار چمک جاتا ہے

ذکر یہ تھا کہ پھٹا گرد کا بادل ناگاہ — رخِ تاباں نظر آنے لگا با صولت و جاہ

ضو سے پیدا تھا کہ بدلی سے نکل آیا وہ ماہ دبدبہ دیکھ کے تھرّا گئے سرہنگِ سپاہ
غل تھا ہر سو کہ بڑا صاحبِ شمشیر آیا
بڑھ کے ہیبت نے صدا دی کہ اٹھو شیر آیا

سقائے اہلِ بیت میدانِ جنگ میں پہنچکر اس طرح نعرہ زن ہوتا ہے۔

ہمہمہ یہ تھا کہ جرار کدہر ہیں نکلیں دشمنِ سیّد ابرار کدھر ہیں نکلیں
جنگ کے تھے جو طلبگار کدہر ہیں نکلیں کئی ملکوں کے نمودار کدھر ہیں نکلیں
ہیں کہاں جو سخن بے ادبی کرتے تھے
کیوں چھپے ہیں جو مبارز طلبی کرتے تھے

جواب میں لشکرِ غنیم کی طرف سے تیر باری ہوتی ہے۔آپ بھی تلوار کو بے نیام کرتے ہیں اور معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

سامنے فوج کے بدلی جو دہواں دہار آئی صورتِ برقِ فلک کوند کے تلوار آئی
مثلِ طوفاں جو ہوا زور سے ہر بار آئی برسا خشکی میں لہو نہر میں بوچھار آئی
ڈر گئے دیکھ کے سب مردم آبی پانی
نظر آنے لگا تا دور گلابی پانی

بڑھ کے پسپا کیا جرار نے جراروں کو مضطرب کر دیا رہوار نے رہواروں کو
سرنگوں کر دیا تلوار نے تلواروں کو خونِ اُگلوا دیا خونخوار نے خونخواروں کو
جاں بلب اسکے ستم دیکھ کے ہر ظالم تھا
دم ہزاروں کے کئے بند غضب کا دم تھا

گھوڑے کی تعریف میں مبالغۂ شاعرانہ سے اس طرح کام لیتے ہیں:۔

جا سکے عکس نہ اس آئینہ تن سے آگے
ہو یہ ہمراہِ صبا بوئے چمن سے آگے
چوکڑی بھر کے نکل جائے ہرن سے آگے
تیر جب ساتھ چلے ہو یہی سن سے آگے
نارسائی کا الم وہم رسا بھی سہہ جائے
اس سے بھی آگے ہو گر وہم تو پیچھے رہ جائے

فوج میں سے ایک دیو پیکر انسان نما پہلوان آگے بڑھتا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

لال تھا چہرۂ ناری بہ غضب صورتِ نار
تھا تنور اس کا شکم ہاتھ ہر اک شاخِ چنار
منہ سے ہر بار تکلم میں نکلتا تھا بخار
سر بسر آگ کا پتلا تھا شریر و مکار
تند خو لشکرِ ظلم سے لپک کر آیا
شعلہ آتش کا جہنم سے لپک کر آیا

رن میں آتے ہی کیا تن کے بہ نخوت یہ کلام
مجھ سا شہ زور نریماں تھا نہ بہرام نہ سام
دم فنا ہوتے ہیں جب کھنچتی ہے میری صمصام
پاؤں فوجوں کے ٹھہرتے نہیں سنکر مرا نام
جراتیں گرم مزاجوں کی رہیں سرد اب تک
مجھ سے سرکھہ نہ لڑا کوئی جوانمرد اب تک

عباس غازی جواب میں فرماتے ہیں:۔

سامنے ہم سے جری کے یہ تعلی یہ غرور
یہ فسوں سازیاں یہ مکر یہ حیلے یہ زُور
تجھ کو شعلہ جو بنائے ہے مزاجِ محرور
اب ہوئی جاتی ہے دم میں وہ حرارت کافور
جوشِ جرات کا جو ہو پھر کہیں رکتا ہوں میں
تو اگر آگ کا پتلا ہے تو دریا ہوں میں

اپنے غرّے میں نہ اِن باتوں کو سمجھا وہ یل
صورتِ مارِ سیہ غیظ میں کھانے لگا بل
تان کر نیزۂ سرتیز بڑھا بہرِ جدل
تن کے چلّایا کہ اے بازوئے شبیر سنبھل

دشمنِ سخت کو جرات مری نرماتی ہے
میرے نیزے کی انی کوہ کو برماتی ہے

بولے عباس کہ سنبھلے ہوئے ہیں ہم کرّار
دشمنوں سے کبھی غافل نہیں ہوتے جرّار
دیکھ رکھیں یہ وغا فوج میں جو ہیں سردار
لیں گے ہم ہاتھ میں نیزہ نہ سپر نہ تلوار

چھین لیں گے یہی نیزہ ترا کچھ دیر نہیں
کسی حربہ کا جو محتاج ہو وہ شیر نہیں

وار پھر اس نے کیا سینہ پہ چمکا کے سمند
ہمکا ہاں کہہ کے ڈرانے کو علی کا فرزند
جھجکا نامردِ جگر ہل گیا کانپے سب بند
ہاتھ بہکا تو سناں ہو گئی تھرّا کے بلند

وقت وہ مل گیا جس وقت کی تدبیریں تھے
رخش کو ایڑ جو کی پہلوئے بے پیر میں تھے

تیغ لی میان سے خودسر نے بصد غیض و غضب
ہنس کے فرمایا کہ ہاں لطف لڑائی کا ہے اب
کھینچی شمشیرِ دو دم جب صفتِ میرِ عرب
وار چلنے لگے سن سن متوجہ ہوئے سب

دھوپ میں کوندے کے جس وقت چمک جاتی تھی
آنکھیں سب دیکھنے والوں کی جھپک جاتی تھی

پہلوان کو موت کے گھاٹ اتار کر دریا میں پہنچتے ہیں۔

دیکھ کر پانی کو یاد آ گئی بچوں کی جو پیاس
آبدیدہ ہوئے صدمے سے جنابِ عباس
اس عطش میں تھا زبس تشنگیٔ شاہ کا پاس
مشک لی کاندھے سے منہ پھیر کے با حالتِ یاس

تسمہ غازی نے بصد رنج و محن کھول دیا
مشک نے دیکھ کے پانی کو دہن کھول دیا

جتنے عرصہ میں بہشتی نے بھری مشک اِدھر — اتنی مہلت میں قریب آ گئے پھر بانیٔ شر
شور برپا تھا کہ اب جانے نہ پائے صفدر — گھر گئے حضرت عباس علی دریا پر
دم میں تلوار پہ تلوار نظر آنے لگی
گھاٹ پر آہنی دیوار نظر آنے لگی

گھاٹ تک نہر سے آیا جو لپک کر جرّار — دیر تک خون کے پیاسوں سے چلی پھر تلوار
ہر طرف نعرۂ شیرانہ تھے ہر سمت تھے وار — پر نہ کم ہوتی تھی اُمڈی تھی یہ فوجِ قہار
بھیڑ اک آن میں اس سے بھی سوا آہ پڑی
تیغ بازوئے علمدار پہ ناگاہ پڑی

گر پڑا دستِ یمیں ہو کے جو شانہ سے قلم — جھک کے دیکھا اُسے اور منہ سے کہا ہائے ستم
کیا قیامت ہے کہ اب شیر ہوئے یہ اظلم — کٹ گیا ہاتھ وہی جس سے وغا کرتے تھے ہم
پاؤں پکڑے ہے اجل خیمہ میں جائیں کیونکر
دسترس کچھ نہیں اب مشک بچائیں کیونکر

مخبروں نے پسرِ سعد کو واں دی یہ خبر — زخمی عباس علمدار ہوئے دریا پر
ایک جرّار پہ ٹوٹا ہوا ہے سب لشکر — یہ قیامت کی مہم تھی مگر اب ہوتی ہے سر
ندیاں خون کی بہ آئیں لبِ ساحل سے
چوٹ کھائی ہے ابھی شیر نے کس مشکل سے

اس طرف شیر کو گھیرے ہوئے تھی فوجِ لعین — برچھی پڑتی تھی کبھی تیغ کہیں تیر کہیں

تھم نہ سکتے تھے جراحاتِ بدن سے سرِ زیں
تر تھی سب خون سے بہشتی کے ترائی کی زمیں
وار کر سکتے نہ تھے ظلم و ستم سہتے تھے
ضرب جب پڑتی تھی اللہ الصمد کہتے تھے

آ گیا پشت کی جانب جو کوئی دشمنِ جاں
پڑ گئی دوسرے شانہ پہ بھی تیغِ براں
مضطرب ہو گئے صدمے سے علمدارِ جواں
غم ہوا یہ کہ کہیں گر نہ پڑے مشک و نشاں
چوب گردن سے عدم کے سفری نے تھامی
مشک بیتابی میں دانتوں سے جری نے تھامی

گر گیا بڑھ کے جو وار ایک ستم کا بانی
سر بھی مانندِ علی کھل گیا تا پیشانی
زیں پہ تھراتا تھا ضرغامِ خدا کا جانی
جو پڑا مشک پہ بھی تیر بہا سب پانی
آس پیاسوں کی جو ٹوٹی تو بصد یاس گرے
پڑ گیا شور کہ لو گھوڑے سے عباس گرے

ساقی کھلا رہے درِ میخانۂ کرم
آباد حق رکھے ترا کاشانۂ کرم
مشہور خلق ہے ترا افسانۂ کرم
منہ سے مرے لگا رہے پیمانۂ کرم
جامِ شرابِ نور کے لب چومتا رہوں
مردانِ صف شکن کی طرح جھومتا رہوں

ساغر میں جب دکھائے چمک صورتِ سہیل
پی جاؤں خم کے خم یہ نہ تیوری پہ آئے میل
افراط بسکہ حد سے سوا ہو ترے طفیل
اتنی لنڈھے کہ تا بہ جناں بہہ کے جائے سیل

ندی چڑھے پہ بادۂ خُم غدیر کی
کوثر میں بہ کے جا ملے کشتی فقیر کی

حضرت عباس نے لشکرِ شام کے قریب پہنچ کر

نعرہ کیا کہ او پسرِ سعد پُر غرور کہدے کہ روکنے میں نہ لشکر کرے قصور
پہنچوں نہ پاس نہر کے دل سے رہے یہ دور گر شیر ہوں تو مشک کو بھر لوں گا میں ضرور
آج آبرو سپاہ کی کھونی ہے گھاٹ پر
تلوار خوں بھری ہوئی دھونی ہے گھاٹ پہ

ناگاہ مثلِ سیل بڑھی تیغ آبدار بحرِ فنا میں ہونے لگے غرق نابکار
دم میں ہوئی یہ گھاٹ پہ چاروں طرف پکار بھاگو کہ باڑھ آگئی ساحل پہ ایک بار
بیڑا تباہ ہے سپہ بے دریغ کا
پانی چڑھا ہوا ہے بہشتی کی تیغ کا

آپ کی شمشیر آبدار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

قتال و شوخ طبع دل آزار و جنگجو حاضر جواب تیز زباں بہرِ گفتگو
جوہر ہیں سر بسر کہ پری ہے کشادہ رو معشوق کج ادا کے سب انداز ہو بہو
گرنے سے نہ کسی کے سنبھلنے سے کام تھا
رستہ ہو یا نہ ہو اُسے چلنے سے کام تھا

اس کو گرایا اس پہ پڑی اس پہ چل گئی کوندی اٹھی گری یہ چلی وہ نکل گئی
چھوڑ آئی جس کو اسکی اجل آکے ٹل گئی ندی لہو کی زخم سے اُسکے ابل گئی
چلتی ہے ہاتھ سے نہیں محتاج پاؤں کی

جوہر ہیں جسم میں کہ قبا دھوپ چھاؤں کی

گھوڑے کی تعریف

پتلا بنا ہوا ہے جو سرعت کا سر بسر ہر دم قدم بھی رہتے ہیں آمادۂ سفر
بیتاب ہو کے اُڑ گیا پتّا ہلا اگر فوراً مڑا سوار کی پتلی پھری جدھر
نازک وہ جلد صاف جو آئینہ وار ہے
سرخی رگوں کے خوں کی اُدھر آشکار ہے

بیتاب کچھ سوا دلِ پُر اضطراب سے پانی پہ ہو رواں تو سبکتر حباب سے
بڑھنے ہیں جھوم جھوم کے افزوں سحاب سے اڑتے ہیں بڑھ کے نکہت عطرِ گلاب سے
ساتھ اسکے ہو تو راہ سے پیکِ نظر پھرے
کاوے وہ ہوں کہ دیکھ کے گردوں کا سر پھرے

ہوتے تھے بحرِ خوں میں عدو غرق دمبدم گرتے تھے خاک پر جسد و فرق دمبدم
گردوں پہ کانپتا تھا شہِ شرق دمبدم ہر سو تڑپ کے گرتی تھی اک برق دمبدم
رنگیں تھا خوں کی دھاروں سے دھارا فرات کا
دریائے خوں بنا تھا کنارا فرات کا

شمشیرِ خوف قلب پہ جب ہر نفس چلے تلواریں پاس بھی ہوں تو کس طرح بس چلے
پھیرا ادھر تو ڈر کے اُدھر کو فرس چلے ڈر کر شریر ایک چلا تھا کہ دس چلے
بھاگے جو سو ہزار چلے بھیڑ چھٹ گئی
یاں تک کہ گھاٹ چھوڑ کے سب فوج ہٹ گئی

کرتی تھی خونیوں کو جو تلوار غرق خوں ہر دم مع سمند تھے اسوار غرق خوں

کھا کھا کے زخم ہوتے تھے خونخوار غرق خوں کشتی ستم کی ہوتی تھی ہر بار غرق خوں
بیڑا تباہ تھا سپہِ بے دریغ کا
چشمہ ابل پڑا تھا بہشتی کی تیغ کا

بھاگڑ جو یہ شجاع نے دیکھی دمِ جدل نعرہ کیا کہ او رے پسرِ سعدِ بد دغل
حیراں ہوں میں تمہیں تھا انہیں کے دلوں پہ بل تنہا کے ڈر سے بھاگتے پھرتے ہیں دل کے دل
اب تک کوئی جچا نہیں اپنی نگاہ میں
بودے کہاں کے تو نے بھرے ہیں سپاہ میں

مجبور تو سمجھتا تھا دیکھا ہمارا قہر جھجکیں نہ ہم اگر امنڈ آئیں تمام شہر
کس جا چھپا دیئے ہیں وہ نام آورانِ دہر لے کہہ کے روک لیں ہمیں جاتے ہیں سوئے نہر
عزت جنہیں ہے بات پہ وہ لوگ مرتے ہیں
کہتا ہے جو زباں سے وہ ہم کہہ کے کرتے ہیں

کچھ بھاگ گئے کچھ تھمے بھی کہ روکیں جری کو ہم ساحل کے پاس جم کے صفیں باندھ لیں بہم
یاں بڑھ کے حملہ ور ہوئے عباسِ ذی حشم ہر سو چمک چمک کے گری تیغ برق دم
مصروف آپ پھر ہوئے تیغ آزمائی میں
مچھلی سے لوٹنے لگے لاشے ترائی میں

ٹھنڈے شریر گھاٹ پہ ہوتے تھے بار بار خود آبرو بچی ہوئی کھوتے تھے بار بار
نام اپنے نامدار ڈبوتے تھے بار بار دریا پہ ہاتھ جان سے دھوتے تھے بار بار
چل سکتا زور کیا سپہِ بے دریغ کا
پانی چڑھا ہوا تھا بہشتی کی تیغ کا

گرتا تھا دمبدم لبِ جو خوں بڑوئے خوں
کٹتے تھے سر کہ لوٹ رہے تھی سبوئے خون
ساحل کے پاس جاتی تھی دریا میں جو خوں
سکانِ بحر ابھرنے لگے پا کے بوئے خون

گذرے ادھر سے تاب یہ تھی کس دلیر کی
پانی کا شور تھا کہ ڈکاریں تھیں شیر کی

غنیم کو بھگانے کے بعد حضرت عباس گھوڑا نہر میں ڈال دیتے ہیں۔ اسوقت

ٹھنڈی ہوا جو آئی تو معصوم یاد آئے
سقائے اہلِ بیت نے اشکِ الم بہائے
مضطر ہوئے کہ آبِ خنک گھر میں جلد جائے
کاندھے سے مشک اتار کے پانی کے پاس لائے

ظاہر ہے پیاس بچوں کی بدعت سپاہ کی
کھولا دہن تو مشک نے بھی سرد آہ کی

جب مشک بھر کے نہر سے نکلا وہ ذیوقار
دشمن کی فوج میں یہ ہوئی ہر طرف پکار
لو مشک بھر کے لے چلے عباس نامدار
اڈہی سپاہ دوڑ پڑے سینکڑوں سوار

محصور پھر ترائی میں وہ شیر ہوگیا
چھائی گھٹا کہ نہر پہ اندھیر ہوگیا

ادھر خیمے کے باہر حضرت امام حسین حضرت علی اکبر سے کہہ رہے ہیں۔

ہاں چند گام بڑھ کے کرو غور سے نظر
کیا رنگ ہے لڑائی کا عباس ہیں کدھر
ہے اس طرف کا عزم کہ جاتے ہیں نہر پر
دہشت سے منتشر ہیں کہ ہیں گرد اہلِ شر

ہو خیریت کہ اہلِ شقاوت کا دور ہے
مضطر ہے دل کہ نہر پہ کیسا یہ شور ہے

اکبر یہ سن کے بڑھ گئے آگے کئی قدم
اور کی نگاہ سب طرف اٹھ اٹھ کے دمبدم

آئے نظر جو حضرتِ عباس ذی حشم مڑ کر صدا یہ دی شہ دیں کو بچشمِ نم
سب فوج ڈٹ گئی ہے یہ اس وقت رنگ ہے
بابا کنارِ نہر قیامت کی جنگ ہے

چھائی ہوئی ہے چار طرف شام کی سپاہ لاکھوں کے بیچ میں ہیں علمدار عرش جاہ
ہے قصد اس طرف کا پہ ملتی نہیں ہے راہ تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ہر غول بھاگ کے پھرتا ہے دمبدم
پھٹ پھٹ کے ابر ظلم کا گھرتا ہے دمبدم

یہ کہتے کہتے تکنے لگے اس طرف بغور آواز دی کہ ہو گیا اس وقت رنگ اور
کچھ اب تو وار کرتے ہیں بڑھ بڑھ کے اہلِ جور کیجئے دعا حضور کہ اچھا نہیں ہے طور
لشکر تمام دشمنِ جاں ایک تن کا ہے
عمو کی خیر ہو کہ یہ حملہ ستم کا ہے

لو ہے غضب وہ ہو گئے مجروح عمو جاں واحسرتا وہ ہو گئی پوشاک خونچکاں
افسوس گرتے گرتے وہ سنبھلا ابھی نشاں ہے ہے وہ تیر ظلم لگا وہ پڑی سناں
وہ سر پہ ضرب گرز گراں بار پڑ گئی
اے لو وہ دوشِ پاک پہ تلوار پڑ گئی

جھکتے ہیں دمبدم ہوا جاتا ہے جی نڈھال طاقت جواب دے چکی بچنا ہے اب محال
مجبور زخم کھاتے ہیں ممکن نہیں جدال وقتِ مدد ہے آئیے یا شبّر ذو الجلال
ہے ہے سپاہ گرد سے ٹلتی نہیں ہے اب
تلوار عمو جان کی چلتی نہیں ہے اب

جس وقت کہہ رہے تھے یہ ہم شکلِ مصطفا
دی افسرانِ فوج نے ناگاہ یہ صدا
لو گر پڑے فرس سے علمدارِ باوفا
سر ہو گئی غضب کی مہم ہے خوشی کی جا

اس دم بڑے دلیر کو مارا ترائی میں
لے ابنِ سعد شیر کو مارا ترائی میں

حضرت امام حسین صاحبزادے کو ساتھ لیکر بھائی کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ حضرت علی اکبر راستے میں ایک مقام پر ٹھیر جاتے ہیں۔ اور ہاتھ کے اشارے سے کوئی چیز دکھا کر کہتے ہیں۔ ع

بابا یہ غرقِ خوں ہیں چچا جان دیکھئے

دیکھا یہ حال شاہ نے بڑھ کر بدردو غم
مہماں ہیں ایک دم کے علمدار ذی حشم
ہے پاش پاش گل سا بدن سر سے تا قدم
زخموں سے خون تازہ ابلتا ہے دمبدم

ریتی پہ دونوں ہاتھ پڑے ہیں قلم کہیں
غلطاں لہو میں مشک کہیں ہے علم کہیں

آثار مرگ ہیں رخِ انور سے آشکار
اکھڑا ہے دم کراہ رہے ہیں بحالِ زار
ہو ہو کے بند کھلتی ہے یوں آنکھ بار بار
جس طرح وقت مرگ کسی کا ہو انتظار

یہ دیکھتے ہی جنابِ امام پہ بجلی سی گر جاتی ہے۔ آپ نوجوان بھائی کا سر گود میں لے لیتے ہیں۔ مگر مرنے والے کی حالت غیر ہے۔ اور مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

لب تھرتھراتے ہو گیا چہرے کا رنگ زرد
یوں آہ کی کہ ہلنے لگا چرخِ لاجورد
انگڑائیوں سے بڑھ گیا ہر زخمِ تن کا درد
ماتھا عرق سے تر ہوا اور ہاتھ پاؤں سرد

آئی پھر اور کچھ نہ صدا گوشِ شاہ تک
کلمہ پڑھا تو اشہد ان لا الہ تک

*

حکمِ خدیو طبع پہ نافذ ہوا ہے اب
باندھے کر سپاہِ مضامین بصد ادب
میداں میں افسرانِ معانی بھی ہوں طلب
باہم صفیں جمائے مرتب ہو فوج سب
جرأت پہ ایک ایک جواں ہو تُلا ہوا
آگے رہے نشانِ فصاحت کھلا ہوا

ہر بند سے نمود ہے سامانِ کارزار
ہر مصرعہ درست پیادوں کی ہے قطار
نقطے ہیں یا اُٹھی ہوئی ڈھالیں ہیں بیشمار
لفظوں کی ہے نشست کہ گھوڑوں پہ ہیں سوار
کل معرکہ ہے سامنے ہر منہ شگاف کے
نیزے تلے ہوئے ہیں کہ مرکز ہیں کاف کے

حضرتِ عباس کی آمد کی دہوم ہے۔ ہر چیز پر خوف طاری ہے۔

طاری ہے بسکہ خوف علمدارِ نامور
گر گر کے برگ بھاگ رہے ہیں اِدھر اُدھر
سنبل بسانِ زلف پریشاں ہے سر بسر
سکتے میں ہے کھلے ہوئی نرگس کی چشمِ تر
کھلتے ہیں غم سے لب نہ سر و پا کا ہوش ہے
ہر غنچہ فکرِ تازہ میں گویا خموش ہے

پھولوں کی بدحواسی کے متعلق کہتے ہیں۔ ع
پھولوں کے ساتھ اُڑتا ہے خوشبو کا رنگ بھی

اسی سلسلہ بیان میں لکھتے ہیں۔

انداز بیان

یکساں جو خشک و تر میں ہے دہشت سے انتشار　　دریا کو پیچ و تاب میں دم بھر نہیں قرار
گر گر کے سر اُٹھاتا ہے گرداب بار بار　　موجوں کی طرح مچھلیوں کو بھی ہے اضطرار

حضرت عباس جناب امام سے اذنِ جنگ طلب کرتے ہیں۔

عباس واں ادب سے کھڑے ہیں حضور شاہ　　پر دل میں ہے رہ غیظ کہ اللہ کی پناہ
دہنتے ہیں سر کبھی، کبھی ہے لب پہ آہ آہ　　آنکھیں تو سرخ سرخ ہیں اور شیر کی نگاہ
جوش آتا ہے جو لشکرِ ظلم کو دیکھ کر
رہ جاتے ہیں امامِ دو عالم کو دیکھ کر

چتوں سے ہے عیاں کہ رضا دیجئے ہمیں　　دلِ مضطرب ہے اذنِ وغا دیجئے ہمیں
نکلے بخار کچھ وہ دوا دیجئے ہمیں　　محجوب کب تلک ہوں بتا دیجئے ہمیں
ہر اک غلام سرورِ ذی جاہ مر چکا
بچے تمام ہو چکے نوشاہ مر چکا

دیکھا جو شاہ نے یہ برادر کا اضطراب　　فرمایا ضبط چاہئے اے ابنِ بوتراب
تمکو جدا کروں یہ نہیں میرے دلکو تاب　　ہوگا جہاں میں قوتِ بازو نہ دستیاب
دِل ہے قوی جو ابنِ ید اللہ کا ساتھ ہو
پھر زندگی ہے موت جو بے کار ہاتھ ہو

بولے چچا سے بڑھ کے یہ تب اکبرِ غیور　　مجبور کیجے شہ کو محبت سے ہے یہ دور
مرضی ابھی نہیں ہے تو اصرار کیا ضرور　　للہ تھوڑی دیر توقف کریں حضور
رخصت کا حرف لب پہ نہ اب لائیے گا آپ

خادم کے بعد بہرِ وغا جائیگا آپ

جناب امام صاحبزادے کو یہ کہہ کر روک دیتے ہیں۔ کہ چچا کی خواہش بھتیجے کی مرضی پر مقدم ہونی چاہئے۔ پھر حضرت عباس کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ اچھا بھائی اگر تمہارا یہی خیال ہے تو ہم مجبور ہو کر اجازتِ جنگ دیتے ہیں۔ جاؤ خدا دشمنوں پر فتح نصیب کرے۔ اور زخم چشم روزگار سے بچائے عباسِ جری کے چہرے پر رونق آجاتی ہے۔ آپ حرم سے رخصت ہونے کے لئے وارد خیمہ ہوتے ہیں۔ زینبِ خستہ جگر بھائی کی بلائیں لیتی ہیں اور

حضرت کا تھا یہ حال کہ گردن کئے تھے خم — تھا جوشِ غم سے آنکھوں پہ رومال دمبدم
تصویرِ غم تھیں زوجۂ عباس ذی حشم — ظاہر نظر سے تھا کہ ہوئے اب تباہ ہم

اس وقت حضرت عباس نے

دیکھا جو مڑ کے بالی سکینہ کو ناگہاں — جھک کر اٹھایا گود میں با چشمِ خونفشاں
بوسے دہن کے لیکے یہ بولے کہ میری جان — ہیئر اگئے ہیں پیاس سے لب خشک ہے زباں

بی بی مقامِ حسرت و رنج و ملال ہے
عمو ہے اندھا اور تمہارا یہ حال ہے

خوں جوش میں ہے اب مرے دل کو نہیں ہے تاب — سیراب تم اگر ہو تو جائے یہ اضطراب
عمو نثار مشک کوئی ہو تو دو شتاب[1] — دریا کے سمت جاؤں پئے جستجوئے آب

بڑھ جائے آبرو مری بی بی کا کام ہو
سقا تمہارا ان کے بہشتی بھی نام ہو

---

[1] شتاب۔ جلدی۔ اب متروک ہے۔

اُتری یہ سُن کے گود سے وہ پارہ جگر
سوکھی سی مشک لا کے یہ بولی بچشم تر
سنتی ہوں گھاٹ روکے ہیں فوجیں بشور و شر
اچھا سدھارو غیظ نہ آئے تمہیں اگر
جوشِ غضب میں ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو
خود اُن سے مانگ لیجو کہ جنگ و جدل نہ ہو

حضرت عباس حضرت سکینہ کو دلاسہ دیتے ہیں کہ تم گھبراؤ نہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہونگے۔ اس کے بعد

تسلیم کر کے شہ کو ہے چست کی کمر
جھک کر علم کو دوش پہ رکھا بکر و فر
دے کر قدم رکاب میں اور یال تھام کر
اک جست میں فرس پہ ہوئے تن کے جلوہ گر
لی ہاتھ میں لجام تو بے تاب ہو گیا
گرما کے رخش اُڑنے کو سیماب ہو گیا

سراپا میں یہ بند شاعرانہ اندازِ بیان کی ایک عمدہ مثال ہے۔

گیسوئے مشکفام ہیں دودِ چراغِ حسن
خوشبو سے دمبدم ہے معطر دماغِ حسن
ظلمت میں نور سے ہی لبالب ایاغِ حسن
سنبل یہ ہیں تو چہرۂ رنگیں ہے باغِ حسن
ہاتھ آگیا ہے نورِ تجلی سحاب کو
حلقہ میں شب لئے ہوئے ہے آفتاب کو

کاندھے پہ ہے جو احمدِ مختار کا علم
پھرتے ہیں گرد منزلت و شوکت و حشم
اوج اپنا دیکھ کر وہ سر افراز و محترم
تن تن کے جھومتا ہے بصد ناز دمبدم
پنجہ کو فوق شمس پہ ہے ارتفاع سے
پرچم الجھ رہا ہے خطوطِ شعاع سے

ناگہ رجز جو پڑھنے لگا غیظ میں جری ڈر سے ہوئی تنوں میں شجاعوں کے تھرتھری[1]
وہ دبدبہ وہ شان وشکوہِ غضنفری نعرے وہ تھے کہ گونجتا تھا چرخِ چنبری

لب پر یہ تھا کہ ضیغم ضرغامِ دیں ہوں میں
کثرت سے دشمنوں کی ڈروں وہ نہیں ہوں میں

اتنے میں

دی بڑھ کے یک بیک پسرِ سعد نے صدا بے شک شجاع آپ ہیں اے ابن مرتضا
منظور ہم کو آپ سے ہرگز نہیں وغا خود جنگ کیجئے تو ہمارا قصور کیا؟

آپ نے جواب دیا۔ کہ تو جاگیر و زر کی طمع میں آلِ نبی کا دشمن ہو رہا ہے۔ اور تجھے۔

مطلق نہیں ہے ڈر غضبِ کردگار کا اللہ رے نشّہ دولت ناپائدار کا

تو آج جاگتا نہیں سوتا ہے ہوشیار دولت کا نشہ دین کو کھوتا ہے ہوشیار

پھر ارشاد کیا:۔

دنیا میں زر ہے صورتِ معشوق بیوفا لازم حذر ہے اس سے محبت نہیں روا
کام آئے جو نہ اپنے بھروسہ ہو اس پہ کیا سب بعد مرگ ایک ہیں سلطاں ہوں یا گدا

اندوہ و یاس و رنج و محن لے کے جائینگے
اک مالِ دنیوی سے کفن لے کے جائینگے

[1] تھرتھری۔ کپکپی۔

مرقع عبرت

زیرِ زمیں وہ اب ہیں جو تھے عرش پر دماغ ڈھکتے تھے جن کے اب کہیں انکا نہیں سراغ
شاہوں کے جو رواق تھے رہتے ہیں انمیں زاغ قبروں کی طرح سینکڑوں ایواں ہیں بےچراغ
نام آوروں کو کھا لیا مٹی نے گور کی
تربت میں ہڈیاں نہیں بہرام گور[1] کی

عبرت کی جا ہے کیا وہ ہوئے صاحبِ حشم اب آپ ہیں نہ فوج نہ وہ طبل نے علم
خود ڈھونڈھتا ہے اوج ہمایوں کو دمبدم گردش میں جام ہے کہ نہاں کسطرف ہے جم[2]
سکتے میں خود ہے قصر کہ قیصر کدھر گیا
حیراں ہے آئینہ کہ سکندر[3] کدھر گیا

پھر ارشاد کیا کہ

ہمراہ لیتا آیا ہوں مشکیزۂ حرم بچے ہیں در پہ آس لگائے بصد الم
لے کہہ کہ سدِّ راہ نہ ہو لشکرِ ستم لے جاؤں جلد آب کہ بچ جائیں اُنکے دم
صدمہ سے اور آفتِ تازہ گذر نہ جائے
عرصہ نہ کر ارے کوئی معصوم مر نہ جائے

مگر شقی نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہنے لگا کہ یہ یزید کا حکم نہیں ہے۔ اور ہم حاکم کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

---

[1] بہرام گور۔ ایران میں ایک بادشاہ گذرا ہے۔ جو گورخر کے شکار کا شوقین تھا۔ [2] جم جمشید بادشاہِ ایران مراد ہے اس کا جام مشہور ہے [3] یونان کا ایک زبردست بادشاہ جس نے والیِ ایران دارا کو شکست دی تھی۔ آس لگانا۔ امید باندھنا۔ انتظار کرنا۔

تھرا گئے یہ سن کے علمدار باوفا
فرمایا کیا یہ بکتا ہے او دشمن خدا
ہاں سچ یہ ہے لعیں کوئی تجھ سے نہیں سوا
پتھر ہے قلب ہو گا نصیحت پذیر کیا
لے یاں سے ٹل نہ جائیو جس جا کھڑا ہے تو
معلوم اب ہوا کہ سپاہی بڑا ہے تو

زور بیان

فرما کے یہ نیام سے شمشیر تیز لی
غصہ میں تن کے دوش پہ بہر ستیز لی
جم کر عنانِ رخش پئے جست و خیز لی
واں اس شقی نے خوف سے راہ گریز لی
بیتاب رزمگاہ کی حد سے نکل گیا
آہو تڑپ کے شیر کی زد سے نکل گیا

ساقی نامہ

ہاں ساقیا کدھر ہے مئے لالہ فام دے
کیفیت سرور جو دل کو مدام دے
ہوں اہلِ ظرف جام پہ ہر بار جام دے
یوں مست ہوں کہ نشہ شجاعت کا کام دے
ہمدم سمجھ کے تیغ کا منہ چومنے لگوں
فوجیں بڑھیں تو مثلِ اسد جھومنے لگوں

اس کے بعد حضرت عباس کی معرکہ آرائی کا ذکر ہے +

پھرتے تھے آپ صورت ضرغام خشمگیں
غصہ میں آسماں نظر آتا تھا نے زمیں
لرزاں بدن چڑھی ہوئی کہنی تک آستیں
زلفوں پہ گرد رخ پہ عرق اور جبیں پہ چیں
سرخی بیاض چشم میں تھی قتل عام سے
قطرے ٹپک رہے تھے لہو کے حسام سے

وہ سر جدا یہ جسمِ نجس خاک پر طپاں وہ جاں بلب یہ حلق بریدہ وہ خونچکاں
وہ سرد اُسکے جسم میں گرمی وہ نیم جاں ہر سو وہ خنجروں کی صدائیں کہ الاماں
کاٹا اُسے کسی نے کی جو منہ سے آہ بھی
ڈوری سے قطع کر دیا تارِ نگاہ بھی

تلوار کی تعریف میں یہ اشعار خوب ہیں۔

آتی ہے آبرو سے جدہر وہ قضا شیم ہر ڈھال بڑھ کے کہتی تھی آنکھوں پہ[1] قدم
ہوتی تھیں تیغیں اور کمانیں ادب سے خم گھبرا کے انکسار سے جھک جاتے تھے علم

اس کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ:۔

اک پہلوان دیو تواں پیل و کوہ تن استادہ تھا غرور میں ابرو پہ تھی شکن
رستم[2] سے تیغ چھین لے رنمیں وہ تیغ زن نام اُس کا سن کے کان پکڑتے تھے[3] اہلِ فن
دب جائے پیلِ مست بھی ایسے سوار سے
لچکے کمر پہاڑ کی گھوڑے کے بار سے

دیکھا جو یہ تردّدِ سالارِ فوجِ شام کلے کی طرح کھانے لگا بل سیاہ خام
پاس آیا ابنِ سعد کے اور یہ کیا کلام مردوں کے امتحاں کا ہے یہ وقت یہ مقام
میں اب وغا کو جاتا ہوں سب فوج لڑ چکی
لیکن یہ دیکھ لیں کہ لڑائی بگڑ چکی

شمر خوش ہو کر اجازت دے دیتا ہے۔ اور پہلوان مقابلہ عباس کیلئے بڑھتا ہے۔ اس کے خود و سپر اور گرزِ گراں کے متعلق کہتے ہیں کہ

[1] آنکھوں پہ قدم لینا۔ عزت و انکسار سے استقبال کرنا [2] رستم۔ ایران کا ایک شہ زور پہلوان گزرا ہے
[3] کان پکڑتے تھے۔ مراد پناہ مانگتے تھے۔ لرزتے تھے۔

وہ خود جس کو دیو بہن لے تو ٹھیک آئے — رستم کے سر پہ گر ہو تو لنگر سا بیٹھ جائے
گرزِ گراں جو فیل کے مستک پہ آزمائے — اس طرح پست ہو کہ نہ تڑپے نہ سر ہلائے
لی تھی سپر وہ ساتھ حجف جو نے آڑ کو
دامن کے دور میں جو چھپا لے پہاڑ کو

پہنچا لعیں جو ابنِ علی کے حضور میں — گھوڑے کی باگ روک کے جھوما غرور میں
یوں آتشِ غضب تھی دلِ بے شعور میں — شعلہ کبھی بھڑکتا ہے جیسے تنور میں

پھر حضرت عباس کو دعوت مقابلہ دیتے ہوئے اس طرح گویا ہوا۔

لے ہوشیار ہو کہ گیا وقتِ صفدری

گونجی ادھر سے شیر کی آواز بکار بس — اتنا مزخرفات نہ بک بار بار بس
شعلے کی طرح کیوں ہے عبث بیقرار بس — آتش مزاج ہے یہ ہوا آشکار بس

پھر ارشاد کیا کہ ہم گیدڑ بھبھکیوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں یہ جھوٹی تعلیاں بے سود ہیں۔ صیقل سے تیغ خام اصیل نہیں ہو سکتی:۔

لے خیر وقت جنگ ہے تیغ و سپر سنبھال — باتیں بنا بنا کے نہ سر سے بلا کو ٹال
حیلے ترے سمجھتے ہیں ہم او زبوں خصال — جانے دیں بے لڑے تجھے رن ہے یہ کیا مجال
غافل کھڑی ہوئی ہے اجل راہ روک کے
بچنا ہے سہل شیر کو میداں میں ٹوک کے

سمجھا لعیں کہ چل نہ سکیگا یہ مکر و زور — جو ہو سو ہو صبر سے لڑنا پڑا ضرور
دل میں تو فرطِ رعب سے تھا خوف کا وفور — ظاہر میں زیں پہ جھوم کے سنبھلا بصد غرور
جوشِ غضب میں دھوئے جو ہاتھ اپنے جان سے

سرکش نے مڑ کے کھینچ لی تلوار میان سے

ساماں ہوئے شریر کے دل کی امنگ کے
باجے صفوں میں بجنے لگے رنگ رنگ کے
تھے سب کہ دشتِ جنگ میں مشتاق جنگ کے
بڑھ آئے پہلواں حلب و مصر و زنگ کے
فن اپنا جانتے تھے جو تیغ آزمائی کو
آنکھیں لڑیں کہ غور سے دیکھیں لڑائی کو

جلدی میں وار اس نے کیا بیاں کی سپر
تلوار اُچٹ[1] کے رہ گئی چیٹا وہ بے ہنر
اک پہلواں نے تب یہ صدا دی پکار کر
غالب یہ تجھ پہ رعب علمدار ہے یہ ڈر
بھولا کمال تیغ زنی یہ ہراس ہے
رہ با حواس گر تجھے عزت کا پاس ہے

ہے آبرو کا وقت یہ دل میں دہل کے لڑ
بیباک ہو کے ٹھاٹھ کچھ اپنے بدل کے لڑ
دریا کی طرح جوشِ وغا میں ابل کے لڑ
غیرت کی جا ہے جان لڑا[2] دے سنبھل کے لڑ
ہم فن کھڑے ہیں ہاتھ[3] بہکنا نہ چاہئے
نامی جواں ہے دیکھ جھجکنا نہ چاہئے

مگر

سمجھا لعیں کہ اب بچوں گا میں زینہار
طاقت رہی قرار کی نے جراتِ فرار
جب کچھ نہ بن پڑا تو کیا پھر جھپٹ کے وار
روکا جری نے اور چلی تیغ آبدار

---

[1] تلوار اُچٹ کے رہ جانا۔ مراد تلوار کا وار ٹھیک نہ پڑنا [2] جان لڑا دینا۔ انتہائی کوشش کرنا [3] ہاتھ بہکنا۔ مراد ہاتھ کا وار ٹھیک نہ پڑنا۔

پھل تیغ کا سپر پہ لیا بد خصال نے
دامن سے ڈر کے پھینک دئی پھول ڈہال نے

اور پھر تلوار کا ایک ہاتھ ایسا دیا کہ شقی کا دہنا ہاتھ کٹ کر زمین پر جا پڑا۔ کٹے ہوئے ہاتھ کے متعلق کہتے ہیں کہ ؎

تھمتا نہ تھا جو دستِ ستمگار خاک پر
اٹھتی تھی اور گرتی تھی تلوار خاک پر

پہلواں کو زیر کر کے دریا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور دریا کے پاسبانوں سے جنگ شروع ہو گئی۔ لکھتے ہیں:۔ کہ

ساحل پہ چل رہی تھی جو شمشیرِ آبدار — مانندِ موج ہوتا تھا ہر صف کو اضطرار
بارش لہو کی ہوتی تھی ریتی پہ بار بار — بوچھار جا پہنچتی تھی بالائے آبشار

کپڑے فقط نہ سرخ ہر اک کینہ جو کے تھے
پانی کی چادروں میں بھی دھبے لہو کے تھے

ٹھنڈے شریر گھاٹ پہ ہوتے تھے بار بار — خود آبرو بچی ہوئی کھوتے تھے بار بار
نام اپنا نامدار ڈبوتے[1] تھے بار بار — دریا پہ ہاتھ جان[2] سے دہوتے تھے بار بار

چل سکتا زور کیا سپہِ بے دریغ کا
پانی چڑھا ہوا تھا بہشتی کی تیغ کا

اس کشتِ خوں پہ آئی نہ تا دیر جب کمک — کھا کر دباؤ ہٹ گئی سب فوج یک بیک

[1] نام ڈبونا۔ عزت و آبرو کھونا [2] جان سے ہاتھ دہونا زندگی سے مایوس ہو جانا۔

بکٹٹ[1] فرس بھگائے سواروں نے بے دھڑک ۔ سناٹا دم میں ہو گیا مدِ نگاہ تک

جانوں کا تھا یہ پاس کہ سب دور دور تھے

لاشے تھے کچھ شجر تھے فرس تھا حضور تھے

اس کے بعد

دیکھا جو شیر نے کہ نہیں کوئی سدِ راہ ۔ بڑھ کر فرس کو نہر میں ڈالا بعزو جاہ

بھولے نہ تھے جو تشنگیٔ شاہِ دیں پناہ ۔ تسمہ پکڑ کے مشک ڈبوئی بہ اشک و آہ

مشک بھر کر خیمے کا رخ کرتے ہیں ۔ مگر سپاہِ شام چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے ۔ تیروں کی بارش شروع ہوتی ہے اور تلواریں پڑنے لگتی ہیں شاعر حضرت عباس کی اس حالت سے تعاثر ہو کر لکھتا ہے ۔

ریلے ہیں فوج کے کسے سر کاٹیں کیا کریں ۔ ہر سو ہے راہ بند کدھر جائیں کیا کریں

کس طرح دشمنوں سے پناہ پائیں کیا کریں ۔ کیونکر نہ تن پہ تیغ و سناں کھائیں کیا کریں

مشکیزہ ہے علم ہے سنبھالیں کسے کسے

آفت پہ آفت آتی ہے ٹالیں کسے کسے

آخر نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑتے ہیں ۔ دونوں شانے کٹ جاتے ہیں ۔ اور مشک کا سارا پانی بہ نکلتا ہے ۔

حضرت امام یہ حالت دیکھ کر مجروح بھائی کے پاس پہنچتے ہیں ۔ اور بھائی کا سر آغوش میں لیتے ہیں ۔ سقائے حرم ہوش میں آ کر آنکھیں کھول دیتا ہے اور کہتا ہے ۔ ع

[1] بکٹٹ بھگانا ۔ تیز تیز دوڑانا ۔

یہ آخری مراد بر آئی ہزار شکر

پھر نقاہت کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

یہ کہتے تھے کہ ہو گیا چہرے کا رنگ زرد یوں آہ کی کہ ہلنے لگا چرخ لاجورد
انگڑائیوں سے بڑھ گیا ہر زخم تن کا درد ماتھا عرق سے تر ہوا اور جسم پاک سرد
آئی پھر اور کچھ نہ صدا گوشِ شاہ تک
کلمہ پڑھا تو اشہد ان لا الٰہ تک

حالتِ نزع

سینہ میں سانس رک گئی مشکل ہوا سخن حسرت سے کی نگاہ سوئے سرورِ زمن
کھینچ آئی روح رہ گیا تھرا کے سب بدن دو چار بار بند ہوا اور کھلا دہن
رونق جو چشمِ پاک کی تھی کھو کے رہ گئی
گردش سی دونوں پتلیونکو ہو کے رہ گئی

حضرت امین

اے نخلِ بوستانِ سخن گل فشاں ہو پھر اے باغ نظم رشکِ ریاضِ جناں ہو پھر
اے کلک آج بلبلِ رنگیں بیاں ہو پھر بحرِ رواں کی طرح طبیعت رواں ہو پھر
لکھنا ہے وصفِ گلشنِ شاہِ امم مجھے
گل ریزیاں دکھا دے پھر اب اے قلم مجھے
اے نطق آج پھر گہر آبدار ہو اے نظم رشکِ سلکِ درِ شاہوار ہو

اے ذہن وقتِ فکر ہے ہاں ہوشیار ہو　　مصرع پہ موتیوں کی لڑی بھی نثار ہو

کم ہو نہ بحر مشق کی یوں جستجو بڑھے

درِ نجف[۱] کا وصف لکھوں آبرو بڑھے

ہو اس چمک دمک سے علمدار کا بیاں　　ہر دم زمینِ نظم پہ گردوں کا ہو گماں

نقطے ہوں نجم حرف قمر بیت کہکشاں　　صفحہ ہر اک ہو مہر سے دہ چند ضوفشاں

مصرعہ ہر ایک سرو ریاضِ جناں ہو پھر

اس نظم کا بلند جہاں میں نشاں ہو پھر

عباس غازی کی منقبت میں یہ بیت خوب کہی ہے۔

لڑ بھڑ کے جان دی شہِ ابرار کے لئے

پیدا وفا ہوئی تھی علمدار کے لئے

اسی سلسلہ بیان میں یہ بند ملاحظ ہو۔

کہہ کر اخی پکارتے تھے جب کبھی امام　　کرتے تھے عرض حضرت عباس نیک نام

بھائی حسن ہیں آپکے یا شاہ خاص و عام　　یہ عبدِ جاں نثار تو ادنیٰ ہے اک غلام

ذرہ ضیا نہ پائے گا خالق کے نور کی

میرے لئے ہے فخر اطاعت حضور کی

صبحِ شہادت

تاباں فلک پہ بخت ہوا طورِ صبح[۲] کا　　پر تو جہاں میں پھیل گیا نورِ صبح کا

---

۱ درِ نجف، حضرت عباس مراد ہیں ۲ طورِ صبح کا بخت تاباں ہوا طور ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ کو تجلیٔ باری تعالیٰ نظر آئی تھی۔ لغوی معنی یہ ہیں کہ طورِ صبح کا نصیب چمکا۔ مراد یہ ہے کہ صبح نمودار ہوئی اور آفتاب کی روشنی سے اجالا ہو گیا۔

کیوں رنگ ہو سفید نہ کافورِ صبح کا
شبنم نے رو کے دھویا تھا منہ حورِ صبح کا
ہل چل تمام اخترِ تاباں میں پڑ گئی
کشتی ضیائے چرخ کی طوفاں میں پڑ گئی

قائم ہوا مصلے پہ عالم کا پیشوا
کی لہجۂ نبی میں نمازِ سحر ادا
ناگاہ فوجِ ظلم میں طبل وغا بجا
آنکھوں میں ہر دلیر کے پھرنے لگی قضا[1]
لاکھوں سپاہ شام میں واں نحس و شوم تھے
یاں ایک ماہتاب اکثر نجوم تھے

فریضۂ سحری سے فارغ ہو کر حضرت امام حسین رفیقانِ سرگذار کی معیت میں لشکر شام کے سامنے پہنچتے ہیں۔ اور

کچھ بڑھ کے بدرِ چرخِ امامت[2] نے دی صدا
کیوں ساکنانِ شام تمہارا ہے قصد کیا
اُمڈی ہوئی ہے فوج کی یہ کس لئے گھٹا
بارانِ تیر اُن پہ جو پیاسے ہیں بے خطا
یہ بے رُخی عرب کی حمیت کو چھوڑ کے
پھینکو زمیں پہ اپنی کمانوں کو توڑ کے

تا دیر صرفِ پند رہا فاطمہ کا ماہ
آئے نہ راہِ راست پہ لیکن وہ روسیاہ
بڑھنے لگے وغا کو شہِ دیں کے خیر خواہ
دم بھر میں گرم ہو گیا میدانِ رزمگاہ
مدت کے تھے جو دوست وہ شہ سے جدا ہوئے
پہلے رفیق سبطِ نبی پر فدا ہوئے

حضرت مسلم کے لال لڑائی میں کام آتے ہیں۔ اُنکے بعد حضرات عون و محمد

---

[1] آنکھوں میں قضا پھرنے لگی۔ موت نظر آنے لگی [2] بدرِ چرخِ امامت۔ حضرت امام حسین مراد ہیں

جناب امام پر فدا ہوتے ہیں۔ پھر حضرت قاسم حلہ شہادت پہنتے ہیں۔ حضرت قاسم کی شہادت کے بعد حضرت عباس نے امام عالی مقام سے۔

کی عرض اب غلام سے ممکن نہیں ہے صبر — کب تک سہا کرے کوئی ان ظالموں کے جبر
کس کس کے غم میں رویا کریں ہم مثالِ ابر — پانی کو تین دن سے یہ ترسا رہے ہیں گبر[1]
خوں میں نہا کے رن سے کئی نور عین آئے
دریا لہو کے ہم بھی بہا لیں تو چین آئے

یہ سن کے بیقرار ہوئے شاہِ مشرقین — مل کر گلے سے بھائی کے رونے لگے حسین
لب پر یہ تھا کہ اے اسدِ حق کے نورِ عین — کیونکر غمِ فراق میں آئے گا دل کو چین
خیر اب تمہیں بھی ہاتھوں سے دانستہ کھوئینگے
اچھا ہمیں تمہاری جدائی میں روئینگے

خم ہو گئے سلام کو عباس نامدار — حضرت کے گرد پھر کے ہوئے رخش پر سوار
شاطر نے دی خبر یہ ادھر جا کے ایک بار — دریا پہ شیر آتا ہے گھاٹوں سے ہوشیار
ہے ساتھ مشک نہر پہ آنے کی لہر ہے
شمشیرِ آبدار بہشتی کی قہر ہے

ہے زیرِ راں دلیر کے رہوار بے مثال — آہو کی آنکھ شیر کی چتون پری جمال
شعلے کی ہے لپک فرس برق وش کی چال — ہر نعل ہے ہلال ہر اک سم مہِ کمال
غل تھا کہ اس سوار کو زیبا یہی ہے رخش
رکھتا نہیں جواب جو اپنا یہی ہے رخش

[1] مرثیہ نگار نے اہلِ شام کو گبر یا آتش پرست لکھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان تھے

اس دبدبے سے حضرت عباس نیکوکار — پہنچے قریب فوج تو روکا وہ رہوار
نعرہ کیا ٹھہر کے کہ اے قوم نابکار — آتا ہے نہر پر اسد شیر کردگار
بے کار آج پانی کی یہ جستجو نہیں
دریا لیا نہ آج تو کچھ آبرو نہیں

بولے سپاہ شام کے دو چار روسیاہ — خوں میں ڈبائیگی تمہیں آب رواں کی چاہ
یہ سن کے ڈالی قبضۂ شمشیر پر نگاہ — دیکھا بصد جلال و غضب جانب سپاہ
فرمایا ایک حملے میں سب گرد برد ہو
سرگرم کارزار وہ اب ہو جو مرد ہو

سپاہیانہ تعلّی

کیا شمر روسیہ پسر سعد شوم کیا — انبوہ کیا یہ فوج کا ہے اور ہجوم کیا
میری جدال کی نہیں عالم میں دھوم کیا! — جب تیغ کھینچی شام ہے کیا چیز روم کیا
تیغ دودم میں دم سے اڑیں فرق تو سہی
لشکر ہو بحر خوں میں یہ سب غرق تو سہی

پھینکے کماں کشوں نے کئی تیر جب ادھر — لی شیر نے غلاف سے شمشیر شعلہ ور
نعرہ کیا کہ گونج گئے کوہ و دشت و در — گھبرا کے بھاگنے لگے صحرا کے جانور
برسایا ابر تیغ سے خوں اس لڑائی میں
پھولی شفق فلک کی طرح سے ترائی میں

ہوتی تھی دمبدم جو وہ تلوار خونچکاں — غل تھا کہ پھل ہے نخل سروہی کا گل نشاں
لالہ کے پھول کا تھا ہر اک زخم پر گماں — یہ رنگ بوستان شفق میں بھلا کہاں

مانندِ گل جو رنگ ہر اک زخمِ تن کا تھا
دشتِ وغا میں لطف بہارِ چمن کا تھا

آئی ادھر وہ تیغ کبھی گہ ادھر گئی　یکتا ملا تو دو وُا سے فی الفور کر گئی
راکب کے سر پہ گر کے کمر سے گذر گئی　مرکب پہ بیٹھی تنگ کے نیچے اتر گئی
رستہ لیا تھا فوج نے رن سے گریز کا
قبضہ تھا ملکِ فتح پہ شمشیرِ تیز کا

نعرہ کیا کدھر ہیں یلانِ سپاہ شام　بزدل ہے ابنِ سعد نہیں اس میں کچھ کلام
دیکھے تو آ کے فوج کا قصہ[1] ہوا تمام　آیا ہوں میں کہاں سے کہاں کھینچ کر حسام
کشتی ظفر کی فوج کے دریا میں کھے[2] چکا
ضیغم کچھار فضلِ الٰہی سے لے چکا

اندازِ بیان

فرما کے یہ ادھر سے جو یہ صف شکن بڑھا　اس سمت سے بھی روم کا اک پیلتن بڑھا
جنبش ہوئی پہاڑ کو یا کر گدن بڑھا　ضرغام شیرِ حق کی طرف اہرمن بڑھا
رغبت ہوئی جو دیو لعین کو مصاف سے
پریاں پئے نظارہ اڑیں کوہ قاف سے

کچھ دور ہی ٹھہر کے پکارا وہ نابکار　میں آیا بہرِ جنگ خبردار ہو شیار
آگے قدم بڑھے گا گر اے شیرِ روزگار　گردن پہ ہوگا فرق نہ سالم یہ جسم زار

۱؎ قصہ تمام ہونا۔ خاتمہ ہو جانا ۲؎ کھینا چپوؤں سے چلانا۔

مُہلت اجل نہ ایک گھڑی کی بھی دے گی پھر
بے خون بہائے دم نہ مری تیغ لے گی پھر

تعلّی

میں پہلوان روم کا ہوں اے نکو خصال — مجھ سے لڑے یہ دیو کی ہرگز نہیں مجال
عالم پہ آشکار ہے میری وغا کا حال — لڑتا ہوں میں ہزار سے تنہا دمِ جدال
بڑھتا گیا ہے زور ہمیشہ گھٹا نہیں
لاکھوں سے جنگ میں کبھی پیچھے ہٹا نہیں

ہو سامنا تو گیو کا پنجہ مروڑ دوں — کیا گیو ہاتھ رستم دستاں کا توڑ دوں
ٹکر سے فیل مست کے بھی رخ کو موڑ دوں — دو ہو جبل جو تیغ کا اک ہاتھ چھوڑ دوں
ہوتا جو زال مانتا میری حسام کو
اک طفلِ خورد سال سمجھتا ہوں سام کو

فاقے سے تین دن کے ہو تم سے لڑوں میں کیا — ہوتے علی اگر تو لڑائی کا لطف تھا
یہ سن کے آیا غیظ میں فرزندِ مرتضا — فرمایا بس زبان نجس روک بے حیا
کس منہ سے اسم پاک علی، بے ادب لیا
چہرہ بگاڑ دوں گا جو یہ نام اب لیا

دعویٰ ہے ہم سے جنگ و جدل کا جو خیرہ سر — آ منہ پہ تیغ تیز کے بس اب نہ دیر کر
جھک جھک کے بغلیں جھانکتا ہے کیوں زبوں سیَر — تلوار لے نیام سے سینہ ہے یاں سپر

ؔ۱ گیو۔ رستم دستان۔ سام۔ ایران کے شہ زور پہلوان اور سپہ سالار گذرے ہیں۔

دو چار ہاتھ بھالے کے یا اب نکال کے
کوئی سناں کا وار ہی کر دیکھ بھال کے
غصّے میں نیزہ تان کے آیا جو پہلوان | برچھا ادھر سے لے کے بڑھا ضیغم ژیان
اک بند باندھ کے جو دلاور نے دی اُٹھان | مثلِ شہاب اُڑ کے گری خاک پر سنان
پھر تیغِ برق دم بھی جو فوراً علم ہوئی
چوب اس کی نیشکر کی طرح سے قلم ہوئی
افعی کی طرح کھانے لگا بل وہ بد سیر | چلّے سے ایک تیر کیا خیرہ سر نے سیر
سیفِ خدا کی تیغ کا رخ پھر گیا اُدھر | بس طائرِ خدنگ گرا کٹ کے خاک پر
چیں بر جبیں تو غیظ سے وہ بد مآل تھا
گوشے میں گو تھا زاغِ کماں پر ملال تھا
گرزِ گراں کو لے کے بڑھا پھر باہتمام | دو تھا وہ فضلِ حق سے بیک ضربتِ حسام
تاریک پھر تو آنکھوں میں عالم ہوا تمام | بولے یہ بڑھ کے حضرتِ عباس نیک نام
کرتے ہیں مضحکہ ترا نام آورانِ روم
کیوں دن ہے یا کہ شام ہی او پہلوانِ روم
یہ سن کے آیا غیظ میں وہ سرکشوں کا پیر | تیغہ کمر سے کھینچ کے آگے بڑھا شریر
اُٹھی ادھر بھی شیر کی شمشیر بے نظیر | تھرّا کے چرخِ پیر پکارا کہ یا قدیر
رنگت لرز کے زرد ہوئی آفتاب کی
دی کانپ کر زمیں نے صدا بوتراب کی
ڈھالیں تھیں یا کہ کالی گھٹائیں تھیں آشکار | تلواریں مثلِ برق چمکتی تھیں بار بار

پرکار ہو گئے تھے جو کاووں میں راہوار	چلتے تھے جانبین سے قہر و غضب کے وار
کھاتا نہ تھا جری کوئی اس بدگہر کی چوٹ
خالی نہ جاتی تھی مگر اس شیر نر کی چوٹ

ناگاہ زد پہ آ گیا مغرور و خود پسند	اٹھا ادھر سے دست علمدار ارجمند
تلوار یوں چمک کے گری کینہ خواہ پر	جس طرح برق گرتی ہے کوہِ سیاہ پر

پہلوان کو تہِ تیغ کر کے دریا میں داخل ہوئے ہیں وقت دو تیا کی پُر تمثیلی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

انداز بیان

تھی موتیوں کی بطن صدف میں یہ آرزو	سقے پہ ہوں فدا تو بڑھے اور آبرو
دریا میں شیر سا جو در آیا وہ ماہرو	آنکھیں قدم سے ملنے لگے سب حباب جو
ظاہر تھے عکس رایت و عباس ایک جا
تھے زیرِ آب خضر اور الیاس ایک جا

مشکیزہ بھر کے نہر سے باصد محن پھرے	پیاسوں کی یاد آ گئی تشنہ دہن پھرے
لشکر کے اس طرف سے بھی پیمان شکن پھرے	بھاگے تھے منہ جو پھیر کے وہ تیغ زن پھرے
بس پھر تو بزدلا بھی ہر اک شیر ہو گیا
اندی سپاہ نہر پہ اندھیر ہو گیا

۱؎ پرکار ہو گئے تھے۔ پرکار کی طرح ادھر اُدھر گھومتے تھے ۲؎ حضر و الیاس۔ دو مشہور پیغمبر ہیں انکی نسبت مشہور ہے کہ دونوں نے آبحیات پیا ہے اور اسلئے تا ابد زندہ رہیں گے ایک بھائی (حضرت خضر) کی تری پر حکومت ہے، اور دوسرے کو خشکی سے منسوب کرتے ہیں۔

کس کس کی ضرب رد کریں کس کس کا روکیں وار　　اک جان کو ہیں گھیرے ہوئے لاکھ نابکار
تیروں سے ہو گیا ہے بہشتی کا تن فگار　　پڑتے ہیں گرز و نیزہ و تلوار بے شمار
مرنے کا غم نہیں ہے سکینہ کا دھیان ہے
ہے مشک پر نگاہ تو پانی میں جان ہے

اس سمت گاہ مشک کو لائے اُدھر کبھی　　دامن سے گہ چھپا لیا زیر سپر کبھی
گہ تیغ کھائی سر پہ کمر پر تبر کبھی　　ہوش آیا گاہ غش میں ہوئے بے خبر کبھی
برچھی کا پھل کلیجے پہ کھایا نہ غم کیا
نیزہ جری نے تیغ سے فوراً قلم کیا

سینے میں آکے تیر سہ پہلو جو گڑ گئے　　زخمی دل و جگر ہوئے تیور بگڑ گئے
بزدل بھی چار ہات دلاور سے لڑ گئے　　دو تیغے دونوں شانوں پہ اک بار پڑ گئے
ہاتھوں کے ساتھ خاک پہ تیغ و علم گرے
دو کوہ غم دلیر پہ پھٹ کر بہم گرے

عباس نے یہ دل سے کہا اور خم ہوئے　　اب کیا لڑیں کہ ہاتھ تو دونوں قلم ہوئے
کہتے تھے یہ کہ اور ستم پر ستم ہوئے　　دو تیر پار مشک سے ہے ہے بہم ہوئے
اک گرز گاؤ سر سرِ اقدس پہ پھر پڑا
پانی کے ساتھ سقّہ بھی گھوڑے سے گر پڑا

شیرِ خدا کے شیر کا مداح میں بھی ہوں
حیدر کے دشتِ صف کا سیاح میں بھی ہوں
ہاں قفل بابِ نطق کی مفتاح میں بھی ہوں
روشن ہی بزمِ نظم وہ مصباح میں بھی ہوں
جلوہ ہر ایک لفظ میں ہے شمعِ طور کا
یہ پر ضیا ورق ہے کہ دریا ہے نور کا

دُرِّ عدن سخن ہے مرا دُرج ہے دہن
فضلِ خدا سے قلب ہے گنجینۂ سخن
کیا پر بہار ہے یہ مری نظم کا چمن
ہے موتیا کہیں تو کسی جا ہے یاسمن
بادِ خزاں کا دخل نہ کھٹکا ہے خار کا
موسم ہمیشہ رہتا ہے اس میں بہار کا

روتے ہیں شہ اِدھر غمِ قاسم میں زار زار
ہل من مبارزہ کا اُدھر غل ہی بار بار
طالب ہیں اذنِ جنگ کے عباسِ نامدار
اکبر بھی شاہِ دیں سے رضا کے ہیں خواستگار
گہہ دیکھتے ہیں بھائی کو گہہ نورِ عین کو
دو غم کی تیغیں کرتی ہیں بسمل حسین کو

اکبر چچا سے کہتے ہیں ہر دم بچشمِ نم
اے حاملِ نشانِ رسولِ فلک حشم
اذنِ وغا طلب نہ کریں آپ دمبدم
مر جائیں گے پدر جو ہوا آپ کا الم
بے دست و پا ہے جسکو برادر سے یاس ہو
بے کار پھر ہیں ہاتھ جو بازو نہ پاس ہو

مشہور شہ کی جانِ تن زار آپ ہیں
لطفِ حیاتِ سیّدِ ابرار آپ ہیں
حمزہ ہیں آپ جعفرِ طیار آپ ہیں
اب یادگارِ حیدرِ کرار آپ ہیں
بازو قوی ہے آپ سے شاہ انام کا

ﷲ ساتھ چھوڑیں نہ حضرت امام کا

پہلے حضور مجھ سے جو آئیں گے رن میں کام — مٹ جائے گی شبیہ علیؑ فلک مقام
آپ اور ایک دم نہ اگر کھینچئے حسام — پھر میں ہوں اور تیغ ہے اور سپاہ شام
رن کیسا آج دشت میں پڑتا ہے دیکھئے
کیونکر غلام آپ کا لڑتا ہے دیکھئے

اکبر سے ہنس کے حضرتِ عباس نے کہا — بیٹا تمہاری جرات وہمت میں شک ہی کیا
غازی دلیر دلبرِ فرزندِ مرتضا — مصباح بزم یوسفِ کنعانِ مصطفا
تازہ بہار آئی ہے جس میں وہ باغ ہو
اے ماہ تم حسین کے گھر کے چراغ ہو

اکبر چچا کے پاس ادب سے رہے خموش — پر شاہ نامدار کو رقت کا آیا جوش
فرمایا ہم کو آپ سے اب سر یہ بار دوش — تم دونوں کرنا بعد مرے جام مرگ نوش
یہ جان لو کہ زیست کا نقشا بدل گیا
تم اس طرف گئے کہ ادھر دم نکل گیا

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نیکنام — دیکھا کروں یہ ظلم کروں میں نہ کوئی کام
دکھلائے وہ گھڑی نہ خدا مجھکو یا امام — اذن وغا غلام کو دیں شاہ خاص وعام
اب بھی نہ خانہ زاد اگر سر کٹائے گا
آقا وفا کا نام مری ڈوب جائے گا

امام پاک یہ کہکر۔ ع
بتیسویں برس تمہیں ہاتھوں سے کھوتے ہیں

حضرت عباس کو اذن جنگ مرحمت فرماتے ہیں۔

یہ ذکر تھا کہ در سے سکینہ نے دی صدا کیا ہے جو آج خیمہ میں آتے نہیں چچا
دو دن کی تشنگی سے لبوں پہ ہے دم مرا پوچھی خبر نہ آ کے مجھے اُن سے ہے گلا
کیا اب بھی آ کے مجھکو نہ صورت دکھائیں گے
مرجاؤں گی میں پیاس کے مارے تب آئیں گے

محاکات

آیا یہ سن کے خیمے میں ضرغام حیدری داخل میانِ خیمہ ہوا مہرِ خاوری
بچّی کا حال دیکھ کے رونے لگا جری صدمہ ہوا تو غم سے پڑی تن میں تھرتھری
دیکھا بچشمِ یاس سکینہ کو پیار سے
پھر آہ سرد کھینچی دلِ بے قرار سے

پھیلا کے دونوں ہاتھ جو دوڑی وہ مہ لقا جلدی سے جھک کے گود میں عباس نے لیا
فرمایا کیا یہ حال ہے قربان ہو چچا باہیں گلے میں ڈال کے بولی وہ دلربا
للّٰلہ فیضِ ساقیٔ کوثر دکھائیے
اب تو قریبِ مرگ ہوں پانی پلائیے

فرمایا تشنہ لب تمہیں دیکھوں کہاں ہے تاب سوزِ غم و الم سے ہے عمو کا دل کباب
مشکیزہ کوئی دو تو کروں جستجوئے آب سقّا بنوں تمہارا بہشتی ملے خطاب
مہلت ملی اجل سے تو دریا پہ جائیں گے
نکلی کوئی سبیل تو پانی پلائیں گے

تشنہ لب بھتیجی سے مشک لیکر حضرت عباس عازم نہر ہوئے

جاتا ہے ضیغمِ اسد اللہ نہر پر مضطر ہے ڈر سے لشکرِ روباہ نہر پر
مشکیزہ لے کے جاتے ہیں ہمراہ نہر پر پانی کی لے چلی ہے مگر چاہ نہر پر
تن خوف سے ہیں سرد عدو کے ترائی میں
دریا بہیں گے دم میں لہو کے ترائی میں

عباس ہیں جو ضیغمِ ضرغامِ کردگار گھوڑا بھی ہے غزالِ رمیدہ اسد شکار
آندھی بھی اس کی تیز روی سے ہے شرمسار پر کیا سبک قدم ہے کہ اٹھتا نہیں غبار
مشکل ہے شکل برقِ جہانگیر کھینچنا
آساں نہیں چھلاوے کی تصویر کھینچنا

آمادۂ وغا ہے اُدھر لشکرِ گراں ہے اِس طرف زبانِ بہادر گہرفشاں
اے قوم جانتے ہو کہ میں کون ہوں جواں بتلاؤ میرے دوش پہ کس کا ہے یہ نشاں
طوبیٰ کی جان لشکرِ ایماں کی شان ہے
حیدر کا میں نشاں یہ نبی کا نشان ہے

جس دم فرس اڑا کے اتارا ترائی میں پاؤ گے امن کا نہ سہارا ترائی میں
ہرگز نہیں کسی کا اجارا ترائی میں مسکن بس اب رہے گا ہمارا ترائی میں
ممکن نہیں کہ راہ ترائی کی چھوڑ دوں
سدِ سکندری بھی ہو حائل تو توڑ دوں

کس غول کس پرے میں ہیں جنگ آزما جواں دعوےٰ بہادری کا جنہیں تھا گئے کہاں
کس صف میں روم و شام کے مخفی ہیں پہلواں میداں میں آکے جوہرِ جرأت کریں عیاں
آتا ہے شیر ہے کوئی ایسا جو ٹوک لے

جانوں بڑا جری جو بڑھ کے روک لے

اک پہلوان شام بصد نخوت و غرور ۔ باندھے کمر کھڑا تھا بن سعد کے حضور
سنکر کلام حضرت عباس ذی شعور ۔ ظاہر شقی کے رخ سے ہوا غیظ کا وفور
رہنے دیا نہ قہر کی آتش نے ہوش میں
انگڑائی لے کے تن گیا جرأت کے جوش میں

یہ پیل دماں فربہ اندام پہلوان ابن سعد سے اجازت لے کر مقابلہ حضرت عباس کے لئے نکلتا ہے۔

جا پہنچا جب قریب علمدار نامور ۔ گھوڑے کی باگ روک کے ڈالی کڑی نظر
تیور بدل کے کہنے لگا وہ زبوں سیر ۔ آگے بڑھا قدم تو نہ پھر تن پہ ہوگا سر
ممکن نہیں کہ تیغ سے تم کو پناہ دوں
ہاں مشک دو مجھے تو میں دریا کی راہ دوں

محاکات

ایسی کبھی نہ بات سنی تھی جو عمر بھر ۔ گونجا مثال ضیغم یزداں وہ شیر نر
ظاہر ہوا جدال ید اللہ نامور ۔ ابرو کھنچے کہ تیغ دو سر نے اٹھایا سر
غصے سے جھوم جھوم کے اک بار تن گئے
شیر خدا کے غیظ کی تصویر بن گئے

انداز بیان

جرأت نے دی صدا ابھی موذی کو مار لو ۔ نشہ غرور کا ہے چڑھا سر اتار لو
بولی ظفر کہ زد پہ تو ہے نابکار لو ۔ دل نے کہا یہی تو ہے پہلا شکار لو

صولت پکار اُٹھی ابھی خوں میں بھرو اسے
بولی اجل کہ میرے حوالے کرو اسے
کہنے لگی سپر بھی کہ سینہ سپر ہیں ہم — کیا اس کا خوف کھینچئے شمشیر برق دم
اُسکے کلامِ سخت سے پہنچا تھا گو الم — اللہ رے ضبطِ حضرتِ عباس باکرم
کہنے سے بڑھ چلے تھے دلِ ناصبور کے
کچھ سوچ کر ٹھہر گئے ظالم کو گھور کے

کہنے لگے چڑھا کے یہ کہنی تک آستیں — بس اب زباں سے کہیو نہ کچھ اے عدوئے دیں
سبقت کا انتظار نہ ہوتا اگر لعیں — سر کٹ کے تیرا لوٹتا ہوتا ابھی یہیں
کر وار اب کہ کچھ نہیں بھاتا ہے غیظ میں
کھاتا ہے زخم شیر تو آتا ہے غیظ میں

یہ تو بتا کہ ہے تجھے منظور کیا شقی — سمجھا ہے ہم کو جنگ سے مجبور کیا شقی
نزدیک آ کھڑا ہوا ہے دور کیا شقی — مشکیزہ ہم سے لے ترا مقدور کیا شقی
کوہِ گراں ہوں جنگ میں گر پاؤں گاڑ دوں
لے اب جو نام مشک تو چہرہ بگاڑ دوں

یہ سن کے لیس ہو گیا کج باز جنگ پر — چلّے میں جوڑا تیرِ سہ پہلو جھکا کے سر
پھر تو ٹھہر سکا نہ ید اللہ کا پسر — نیزہ اٹھا کے آ گے بڑھا شیرِ پُر جگر
ناوک اُدھر شقی کی کماں سے جدا ہوا
یاں تھا خدنگ نوکِ سناں میں چھدا ہوا

بس پھر تو آیا غیظ میں وہ بانیٔ ستم — جھپٹا کمر سے کھینچ کے تیغہ زبوں ستم

صفدر نے بھی میان سے لی تیغ برق دم ڈھالوں کے جانبین سے بادل اُٹھے بہم
تیرہ ہُوا جہاں نظرِ کینہ خواہ میں
دو بجلیاں چمکنے لگیں رزمگاہ میں

سوچا جری کہ جنگ میں بیکار ہے یہ دیر کاوا فرس کو دے کے لیا اس شقی کو گھیر
حلقے میں یوں لئے تھا اُسے اشہب دلیر خوش ہو کے گرد صید کے پھرتا ہے جیسے شیر
اک ہاتھ مارا پا کے جو موقعہ حواس سے
تیغہ شقی کا اڑ گیا قبضے کے پاس سے

پہلی خطا پہ اپنی خجل تھا جو بے ہنر سر کو جھکا کے کرنے لگا پھر خدنگ سر
عباس بھی اُدھر سے بڑھے تیغ تول کر پھر مرغ تیر کے لگے کٹ کٹ کے اڑنے پر
آیا جو تیر دستِ مبارک فرو کیا
پیکاں سے اُس کو نالب سوفار دو کیا

ترکش میں ایک بھی نہ رہا اسکے تیر جب لی دوش سے کمان کیا نی جری نے تب
فرمایا ہوشیار ہو لے ڈھال سر پہ اب اس تیر کا تو توڑ ذرا دیکھ بے ادب
ہو گوشہ گیر ہاتھ سے چلے کو چھوڑ کے
بیکار قوس ہو گئی پھینک اسکو توڑ کے

یہ سُن کے ہوش اڑ گئے اس بدخصال کے جوڑا کماں ہیں تیر ادھر دیکھ بھال کے
گو رخ تھا اس کا آڑ میں لوہے کی ڈھال کے پر صدقے نور عین علی کے کمال کے
مدِ نظر جو چشم کا اس کی نشانہ تھا
حضرت کا تیر بھی اسی جانب روانہ تھا

اِسی سلسلہ بیان میں لکھتے ہیں ؂

ہتیار دیکھ بھال کے گو پر دغل ہوُا
پتلی کی طرح آنکھ میں پیوست پھل ہوُا

صدمے سے کانپنے لگا جسم زبوں سیر — تھرایا ہاتھ چھٹ کے زمیں پہ گری سپر
پہنچا جو تیر کھینچنے کو دستِ بے ہنر — یاں سرسری خدنگ ہوُا دوسرا بھی سر

حریف پہلواں دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جاتا ہے۔ اس وقت

کہنے لگے پکار کے عباس عرش جاہ — ہاں اب تو منہ سے مشک کا لے نام روسیاہ
تکتا تھا مشک کو انہیں آنکھوں سے بدنگاہ — کھو بیٹھا دیدے دیدہ و دانستہ واہ وا!

یہ کہکر شمشیرِ سرفشاں میاں سے باہر کھینچتے ہیں۔

ناگہ گری چمک کے جو شمشیر سر شگاف — فرق اور گلے کو کاٹ کے پھر پہنچی بہ ناف
آگے بڑھی کمر سے تو زینِ فرس تھا صاف — بیٹھی جو پشتِ رخش پہ شمشیرِ خوش غلاف

کھینچا دبا کے ہاتھ سنبھل کر جو زین پر
گھوڑے کا تنگ کاٹ کے اتری زمین پر

تکبیر شیر نے کہی گھوڑے پہ جھوم کے — پونچھا لہو حسام کا قبضے کو چوم کے
پھر لیس ہو کے آئے پرے فوجِ شوم کے — چاوش جتنے تھے سپہ شام و روم کے

کہتے تھے اب لڑا دو لڑائی میں جان کو
مارا ہے اس جری نے بڑے پہلوان کو

آمادۂ جفا ہوئی پھر فوجِ نابکار — چمکا کے رخش آگے بڑھا شیرِ روزگار
نعرہ کہا کہ ہل گئے صحرا کے کوہسار — فرمایا شیر آتا ہے ہاں چھوڑ دو کچھار

حیراں تھے سب ثباتِ قدم سے دلیر کے
دستے تھے فوجِ شام کے پنجے میں شیر کے

ہر سمت یوں جھپٹتے تھے عباسِ مہ جبیں
جاتا ہے جیسے صید پہ ضرغام خشمگیں

تلوار وہ کہ صاف ہوئے جس سے اہلِ کیں
ہاتھوں میں زورِ بازوئے سلطانِ مرسلیں

گرتی تھی مثلِ برق وہ تلوار کوند کر
پامال رخش کرتا تھا لاشوں کو روند کر

زور بیاں

لڑتا تھا شیرِ ضیغم باری ترائی میں
کشتوں کے پشتے ہوگئے ساری ترائی میں

ہر دم جری کی تیغِ دودھاری ترائی میں
ندی لہو کی کرتی تھی جاری ترائی میں

چھینٹیں نہ آنے دیتی تھی خوں کی حضور تک
سبزہ تھا سرخ پوشش ترائی کا دور تک

حملے کیئے جو ضیغمِ ہیجا نے تین چار
بھاگے ترائی چھوڑ کے لشکر کے نابکار

گھوڑوں کو یوں اڑا کے فراری ہوئے سوار
باقی رہا نشانِ رسالہ نہ جز غبار

چھپ چھپ کے بھاگے جاتے تھے جو پُر غرور تھے
لاشوں کے ڈھیر گرد تھے بس اور حضور تھے

غازی نے اسپ روک کے دیکھا ادھر ادھر
آیا نہ تابہ نہر کوئی کینہ جو نظر

پانی کی لہر دیکھ کے ٹکڑے ہوا جگر
یاد آئی تشنگیٔ شہنشاہِ بحر و بر

پیاسوں کی شکلیں پھر گئیں آنکھوں کے سامنے
کھینچی اک آہِ سرد بس اس تشنہ کام نے

منہ کر کے آسمان کی جانب بصد بکا
کہنے لگے یہ حضرت عباس باوفا
کس منہ سے شکر ہو ترے احساں کا اے خدا
دریا تو میں نے تیری اعانت سے لے لیا
اب مشک بھر کے نہر سے لاؤں تو چین ہو
پیاسوں کی آج پیاس بجھاؤں تو چین ہو

انداز بیان

آیا کنارِ نہر جو وہ آسماں جناب
آنکھیں قدم سے ملنے کو حاضر ہوئے حباب
اُٹھ اُٹھ کے چاہتی تھیں یہ موجیں بروئے آب
نظارۂ جمال سے ہم بھی ہوں بہرہ یاب
ساحل کے پاس دیکھ کے شہ کے فدائی کو
پانی گھٹا ہوا بھی بڑھا پیشوائی کو
تھا دل کو تشنہ کاموں کے غم سے جو اضطراب
بھرنے کو مشک نہر میں داخل ہوئے جناب
پنجہ علم کا اور وہ رخِ ابنِ بوتراب
دو آفتاب نہر میں تھے دو بروئے آب
چمکا تھا بخت نہر کے بھی آب و تاب کا
جلوہ تھا اک مقام پہ چار آفتاب کا
پانی سے مشک بھر چکے پیاسوں کی جب حضور
گھوڑے کی باگ پھیر کے پلٹے بصد سرور
گو تشنگی کا تھا جگر و قلب میں وفور
پیاسے ہی نکلے نہر سے عباس باغیور
تھا حال غیر پیاس سے اس رہوار کا
گردن پھرا کے تکنے لگا منہ سوار کا
نکلا پیاسا نہر سے اسپِ وفا پسند
اُمڈی مثالِ ابر سپاہِ دغا پسند
آواز دے رہا تھا یہ شمرِ جفا پسند
کس جا ہیں روم و رے کے یلانِ وغا پسند

ہر پلیتن کو فکر ہوا اب دار و گیر کی
چاروں طرف سے چاہیئے بوچھاڑ تیر کی

یہ سُن کے مستعد ہوئے سب کینہ خواہ — روکی جفا شعاروں نے ضرغامِ دیں کی راہ
زنگ و تتار و شام کی سب یوں بڑھی سپاہ — گھنگھور جس طرح سے گھٹائیں اٹھیں سیاہ
ہر تیرہ رو اٹھا کے سپر پاس آگیا
ابرِ ستم مہِ بنی ہاشم پہ چھا گیا

تنہا ہے شیر اور ہیں دشمن کئی ہزار — لیکن ہے دخل کیا کہ قریب آئے انتشار
دو ہاتھ ہیں سو اُلجھے ہوئے وقتِ کارزار — اس میں علم ہے اسمیں ہے شمشیرِ آبدار
لیں کس طرح سے ڈھال ہیں معذور کیا کریں
تلواریں تن پہ کھاتے ہیں مجبور کیا کریں

لکھتے ہیں راویانِ دل افگار یہ خبر — پہنچا جو اک مقام پہ لڑتا وہ شیرِ نر
مخفی کھڑا تھا واں کوئی ظالم پسِ شجر — ماری شقی نے دوڑ کے تلوار بے خطر
معلوم یہ ہوا کہ فلک پھٹ کے گر پڑا
ہمراہِ تیغ دستِ یمیں کٹ کے گر پڑا

تڑپا زمیں پہ تیغ بکف ہاتھ ایک بار — خم ہو کے دیکھنے لگے عباس نامدار
شانے سے چھوٹنے لگی جھکتے ہی خوں کی دھار — دستِ یسار پر بھی چلی تیغِ آبدار
پیدا ہوا اک اور غم تازہ غم کے ساتھ
بایاں بھی ہاتھ گر پڑا کٹ کر علم کے ساتھ

کرتے ہیں متصل سے لعیں خنجروں کے وار — مجبور زخم کھاتے ہیں عباسِ نامدار

پیاسوں کی یاد میں دلِ مضطر ہی بیقرار ناگاہ چند تیر ہوئے مشک سے بھی پار
بچوں کی تشنگی کا الم دل میں رہ گیا
پانی تمام مشکِ سکینہ کا بہ گیا

پانی بہا جو مشکِ سکینہ سے خاک پر روئے لہو کے اشکوں سے عباسِ نامور
بڑھ بڑھ کے مارتے ہیں لعیں خنجر و تبر کچھ زخمہائے تن کا نہیں رنج و غم مگر
سوتے رواں ہیں چشموں سے دریائے اشک کے
سوراخ دل میں پڑ گئے چھدنے سے مشک کے

ناگاہ ایک تیرِ ستم چشم پر لگا خم ہو گیا کماں کی طرح سے وہ باوفا
پہلو پہ تیر گرز گراں فرق پر پڑا سر پاش پاش ہو گیا ٹکڑے جگر ہوا
چادر لہو کی چہرے پہ آئی جبین سے
غش نے گرایا خاک پہ صفدر کو زین سے

گرتے ہی ہائے موت کے ظاہر ہوئے نشاں تھرایا جسم پھر گئیں آنکھوں کی پتلیاں
ماتھے پہ بھی اجل کا پسینہ ہوا عیاں رگ رگ سے روح کھنچنے لگی آئیں ہچکیاں
پھیلائے پاؤں زیست کی صورت بدل گئی
مثلِ نسیم روح بدن سے نکل گئی

حضرت عباس امام عالی جاہ سے کہہ رہے ہیں۔

بہرِ رسول رن کی رضا دیجئے مجھے صدقہ علی کا اذنِ وغا دیجئے مجھے
حکمِ وغا برائے خدا دیجئے مجھے یادِ خدا میں آج بھلا دیجئے مجھے

چرچا ہے دو جہاں میں سخائے امام کا
رد کیجیے سوال نہ مولا غلام کا

اتنے میں

پردہ اٹھا کے خیمۂ اقدس کا جلد تر
کہنے لگی یہ زینبِ ناشاد نوحہ گر
بھائی کو لے کے آئیے یا شاہِ بحر و بر
مچلی ہوئی ہے در پہ سکینہ بچشم تر
کہتی ہے پیاس سے مجھے صدمہ ہے قہر کا
لے لیں یہ میری مشک جو ہو قصد نہر کا

عباس نے سنا جو بھتیجی کا یہ پیام
کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
کہنے لگے یہ بھائی سے رو کر شہِ انام
پانی کی جستجو تو تمہارا ہے خاص کام
سقائی تم کو آلِ نبی کی گوارا ہے
مشکیزہ جا کے لو کہ یہ عہدہ تمہارا ہے

حضرت عباس خیمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی بھتیجی کے سوکھے ہونٹوں پہ مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

باہیں گلے میں ڈال کے بولی بصد تعب
عمو تمہارے عزم کا کھلتا نہیں سبب
فرمایا تین روز ہوئے تم ہو تشنہ لب
دریا سے لا کے پانی پلاتے ہیں ہم کو اب
عمو نثار روتی ہو تم بات بات پر
مشکیزہ لا دو ہم کو تو جائیں فرات پر

حضرت سکینہ مشک لا کر دیتی ہیں۔ آپ حرم اور امام عالی جاہ سے مل کر میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوئے ۔ شاعر اس وقت آپ کے رونے

مبارک اور علم زرفشاں کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

رفعت علم کی اور وہ شوکت حضور کی دوشِ صبا پہ صاف ہے تصویر نور کی
ظاہر ہے رخ کی ضو سے چمک برق طور کی روشن زمینِ دشت ہے نزدیک و دور کی
ذرے جو چمکے چہرۂ خورشید فق ہوا
طبقہ زمیں کا ضو سے طلائی ورق ہوا

نعرہ کیا یہ بڑھ کے ہم آئیں گے گھاٹ پر پیاسے ہیں تین روز کے جائیں گے گھاٹ پر
پھل برچھیوں کے دھوپ میں کھائیں گے گھاٹ پر دریا لہو کے آج بہائیں گے گھاٹ پر
جانا ہے نہر پر شہ دیں کے فدائی کو
بس خیر ہے اسی میں کہ چھوڑو ترائی کو

تلواریں تول تول کے بولے وہ پُرغرور جانا فرات تک نہیں آسان کچھ حضور
دریائے آہنی سے تو پہلے کرو عبور سمجھو نہ پاس یاں سے ترائی بہت ہے دور
اک اک جوان ادھر کا ہے بھاری ہزار پر
یاں راستہ ہے نہر کا تیغوں کی دھار پر

بپھرا یہ سن کے ضیغمِ ضرغام ذوالجلال فرمایا بڑھ کے تم ہمیں روکو گے کیا مجال
کیا اصل کیا بساط تمہاری ہے کیا ہو مال قہرِ خدا ہے کم نہ سمجھنا مرا جلال
بے گھاٹ دم نہ لیں جو بڑھیں تیغ تول کے
ہو سدِ راہ کوہ تو لے جائیں رول کے

پنہاں ہے نہر گو سپہ روسیاہ سے کچھ خوف خضر کو نہیں ظلمت کی راہ سے
ٹوکے تو کوئی بڑھ کے صفِ کینہ خواہ سے دیکھا نہیں کبھی کہ رکے کوہ کاہ سے

یہ فوج کیا جو راہ ترائی کی چھوڑ دیں
گر سامنے ہو سدِّ سکندر تو توڑ دیں

ہاں اے امیؔن تیغِ علی کا چلن دکھا   تصویر ضرب بازوئے خیبر شکن دکھا
پھر معرکہ میں تیزیٔ تیغِ سخن دکھا   زخموں کا پھر کھلا ہوا رن میں چمن دکھا
احوال جنگ رستمِ شاہ زماں سنا
فردوسی سن کے دنگ ہو وہ داستاں سنا

مضمونِ کہنہ باندھنا اپنا چلن نہیں   موتی نہ جس میں ہوں یہ وہ درجِ دہن نہیں
تیغِ زباں ہو کند تو لطفِ سخن نہیں   تازہ نہ جس میں پھول ہوں یہ وہ چمن نہیں
خوشبو ہمارے باغِ سخن کی کہاں نہیں
گل جس میں غیر کے ہوں یہ وہ بوستاں نہیں

چمکی جو رن میں بڑھ کے وہ شمشیر برق زا   ڈھالیں سروں پہ لیکے چلے واں سے اشقیا
بجلی بڑھی ادھر سے اُدھر سے بڑھی گھٹا   گھوڑا کہیں جما کہیں سمٹا کہیں اڑا
فارس نے کی نگاہ جدھر وہ روانہ تھا
گویا پلک کا عکس اُسے تازیانہ تھا

تلوار کی تعریف

ابرِ مطیر تیغ تھی آئی برس گئی   ناگن کی طرح اٹھ کے گری جس پہ ڈس گئی
لہرا کے آئی سوئے یمین پیش و پس گئی   سر پر گری سوار کے زیرِ فرس گئی
وہ گھاٹ باڑہ اور وہ اس برق زا کا منہ
رخ اس کا جس طرف تھا اُدھر تھا قضا کا منہ

جس صف کے جس پرے کے مقابل وہ ڈٹ گئی
دم لے سکے اُس نے خون پیا اور پلٹ گئی
شعلے کی طرح گاہ بڑھی گاہ ہٹ گئی
یہ صف جلی بھنی تو وہ صف صاف کٹ گئی
شاخِ ستم تراش گئی اس صفائی سے
شانہ جدا تھا کتف سے پہنچا کلائی سے

بھاگے ترائی چھوڑ کے جب دم وہ روسیاہ
ٹھہرے فرس کو روک کے عباس عرش جاہ
دریا کی سمت آنکھ اٹھا کے جو کی نگاہ
پایا نہ تا بہ نہر کسی کو بھی سدِ راہ
پھر تو علی کی شان دکھاتے ہوئے چلے
سوئے فرات رخش اڑاتے ہوئے چلے

محاکات

آئی ہوائے سرد ترائی سے ناگہاں
بھڑکی جو آگ قلب میں اُٹھنے لگا دھواں
پانی جو دیکھا آنکھوں سے آنسو ہوئے رواں
ہونٹوں پہ پھیرنے لگے سوکھی ہوئی زباں
لبریز تھے جو آنکھوں کے ساغر چھلک پڑے
آنسو کے قطرے دیدۂ تر سے ٹپک پڑے

پہنچے لبِ فرات جو عباس نامدار
چاہا کہ ڈالیں نہر میں اسپِ وفا شعار
آئی صدا یہ پشت کی جانب سے ایک بار
آتی ہے سر پہ موت خبردار ہوشیار
آگاہ سب جہاں ہے مری تیغ رانی سے
بس کہہ دیا کہ مشک کو بھر نا نہ پانی سے

رخ پھیر کر جو شیر نے کی اس طرف نظر
دیکھا کہ ایک دیو چلا آتا ہے ادھر
سختی میں سینہ کوہ ہے پتھر دل و جگر
آہن کا سر پہ خود وہ بھاری کہ الحذر

فولاد کی زرہ میں تنِ رشک گیو ہے
پردے میں گویا قاف کے پوشیدہ دیو ہے

حضرت عباس سے آنکھیں چار ہوتے ہی پہلوان آپ سے اس طرح گویا ہوا:-

سنتا ہوں زور و ضرب پہ ہے آپکو غرور
گھوڑے پہ اب سنبھل کے ذرا بیٹھئے حضور
دعویٰ جو میں کروں اُسے سمجھیں نہ آپ زور
ہے دھاک میرے زور کی دنیا میں دور دور
رکتا نہیں جو سدِ سکندر کی آڑ ہو
چٹکی سے پیس ڈالوں تو سرمہ پہاڑ ہو

بولا یہ شیر بیشۂ ضرغامِ ذوالجلال
کھل جائے گا ابھی ترا دعویٰ زبوں خصال
کوہِ گراں کو پھول سمجھ کر نہ ہو نہال
رکھتی ہے تیغ تیز مری برق کا کمال
میدانِ رزم گرم ہوئے کارزار کر
تلوار کھینچ گرز اٹھا بڑھ کے وار کر

پہنچا غرض قریب اڑا کے وہ رہوار
بولا کہ زور اپنا دکھاتا ہوں ہوشیار
یہ کہہ کے ہاتھ پٹکے پہ ڈالا بس ایک بار
زیں پر ادھر سنبھل گیا حیدر کا گلعذار
سردار دیکھنے لگے سب فوجِ شام کے
کرنے لگا وہ زور کمر بند تھام کے

جب پہلوان حضرت عباس کو زین فرس سے اٹھانے میں ناکام رہا تو آپ نے طنزاً فرمایا۔ کہ بس کیا اسی قوت و طاقت پر ناز تھا۔ اب ندامت و خفت بے سود ہے۔ اگر دل میں کوئی اور حوصلہ ہو تو اُسے بھی نکال لے

یہ طعن سن کے غیظ میں آیا وہ بد مآل شمشیر تیز میان سے کھینچی پئے جدال
بیٹھے سنبھل کے رخش پہ عباس خوش خصال کاٹھی سے تیغ دوش سے لی ہمثیال ڈھال

آنکھیں سپاہِ شام کی ضو سے جھپک گئیں
دو بجلیاں فرات کے اوپر چمک گئیں

ہر مرتبہ جو پڑنے لگی تیغ تیغ پر اُڑ اُڑ کے آبِ نہر میں گرنے لگے شرر
بکھرے زمیں پہ پھول گری کٹ کے جب سپر مارا کبھی طمانچے کا ہاتھ اور کبھی کمر

وہ ہاتھ ہٹ کٹی کا لگا یا حواس سے
کاٹیں شقی کی انگلیاں گھائی کے پاس سے

زخم کاری پڑتا ہے۔ اور پہلوان گرمی سے ہانپنے لگ جاتا ہے لکھتے ہیں

پہنچا قریب نہر اسی وقت اہل شر خم ہو کے منہ لگا دیا پانی سے جلد تر
جب ڈگڈ گا کے پی چکا پانی وہ بد گہر پیاسے تھے تین روز کے خون ہو گیا جگر

آنسو بھر آئے چشم کے ساغ چھلک پڑے
آنکھوں سے قطرے خونِ جگر کے ٹپک پڑے

سیراب ہو کے نہر سے نکلا جو بے ادب نیزہ اکھاڑ اٹھ کے زمیں سے بصد غضب
دامن سے اشک پونچھ کے عباس تشنہ لب بیٹھے فرس پہ جھوم کے مثلِ شہ عرب

نعرہ کیا قدم کو بڑھانا سنبھال کے
نوکِ زبانِ سنان کی ذرا دیکھ بھال کے

پانی بھی اب تو پی چکا دریا سے کینہ جو بے آب خشک لب ہیں مگر تازہ دم ہے تو
بہتا ہے کوئی دم میں ترا اب یہاں لہو ہاں بھاگیو نہ کھو کے تنگ ظرف آبرو

بولا شقی حواس ابھی تک تو گم نہیں
دنیا میں آج میں نہیں یا آج تم نہیں
یہ کہہ کے اس نے نیزۂ خطی کو دی تکان — آئی قریب سینہ لچکتی ہوئی سنان
جلدی پھرا دی شیر نے رہوار کی عنان — شمشیر بے اماں بھی اُٹھی چاٹ کر زبان
کھینچا تھا طول جنگ نے بیحد یہ کم کیا
نیزے کو نیشکر کی طرح سے قلم کیا

حریف پہلوان کا ہاتھ کٹ جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

کٹ کر گرا جو ہاتھ معہ گرز گاؤ سر — راہِ فرار تکنے لگا وہ ادھر اُدھر
آواز دی اسد نے کہاں جاتا ہے ٹھہر — جھپٹا یہ کہہ کے ضیغمِ یزداں کا شیر نر
دستِ قوی پڑا کمرِ نابکار پر
مارا خدا کے شیر نے پنجہ شکار پر

اور اسے کمر بند سے پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا اور ساتھ ہی تلوار سے جسمِ نحس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

صیدِ زبوں کو مار چکا جب وہ شیر نر — حسرت سے مڑ کے کی سوئے عصمت سرا نظر
یاد آ گئی جو تشنگیٔ شاہِ بحر و بر — مشکیزہ بھر کے نہر سے نکلے بکرّ و فر
پانی سے لب جو تر نہ ہوئے اس دلیر کے
گھوڑا بھی نکلا نہر سے منہ اپنا پھیر کے
بڑھ کر صدا یہ شمر نے دی پھر سپاہ کو — ہاں اے جوانو روک لو اب بڑھ کے راہ کو
دو راستہ نہ خیمے کا اس روسیاہ کو — گھیرا یہ سن کے شام کے بادل نے ماہ کو

تلواریں تھیں غضب کی تو خنجر تھے قہر کے
تیغوں کی موجیں مل گئیں ساحل سے نہر کے

صفائی بیان

اڈا قریب نہر جو وہ لشکر گراں — غصے سے کانپنے لگے عباسِ نوجواں
تھی مشک ایک دوش پہ اور ایک پر نشاں — قبضے میں تھی دلیر کے شمشیرِ خونچکاں
گھوڑا بڑھا کے خیمہ کی جانب جو پھر گئے
نرغے میں دس ہزار سواروں کے گھر گئے
نیچے سپر کے مشک چھپا کر بچشمِ تر — آگے بڑھے تو پڑنے لگے خنجر و تبر
جب آئی تیغ سامنے سینہ کیا سپر — تیر آئے جب اُدھر سے تو کی مشک پر نظر
ترخوں میں ہو کے سبز علم سرخ پوش تھا
پیاسوں کی فکر مشک بچانے کا جوش تھا
برساتے تھے خدنگ کمیں سے خطا شعار — تیغیں کھنچی ہوئی تھیں ہزاروں سوئے سوار
جو پشت پر تھے کرتے تھے وہ برچھیوں کے وار — کچھ سنگدل لگاتے تھے پتھر بھی بار بار
کس کس کا وار رد کریں کس سے وغا کریں
بتلاؤ اب کہ حضرتِ عباس کیا کریں
تنہا ادھر ہیں آپ اُدھر سینکڑوں عدو — دریا کے پاس پیاسے کو گھیرے ہیں کینہ جو
بڑھتا ہے ضعف تن کا گھٹا جاتا ہے لہو — تھرا رہے ہیں حضرتِ عباس نیک خو
زخموں سے خون ابل کے بہا بڑھ کے رک گئے
تیور اگئے تو مشک سکینہ پہ جھک گئے

گھوڑے پہ غش میں جھوم رہا ہے وہ نامدار
نکلا کمیں سے ایک جفا کار بدشعار
ماری غضب کی دوش پہ شمشیر آبدار
شانے سے ہاتھ کٹ گیا چھوٹی لہو کی دھار

ہیہات اور زور دلاور کا گھٹ گیا
جس ہاتھ میں تھی تیغ وہی ہاتھ کٹ گیا

ناگاہ مشک سے بھی ہوا تیر ظلم پار
مشکیزہ کیا چھدا کہ جگر ہو گیا فگار
خیمے کی سمت پھر کے پکارے بحال زار
لو اے سکینہ تم پہ چچا ہوتا ہے نثار

تیروں سے مشک چھد گئی پانی بھی بہ گیا
شرمندہ تا بہ حشر چچا تم سے رہ گیا

※

میدانِ جنگ میں حضرت عباس کی آمد آمد ہے۔

جاسوس دے رہے ہیں خبر آ کے بار بار
آتا ہے جنگ کو اسدِ شیر کردگار
اے افسرانِ فوج خبردار ہوشیار
میداں میں اب ہے قہر کی ورزش کار زار

یہ جنگ حربِ سام و نریماں نہ جانیو
عباس کی وغا ہے کچھ آساں نہ جانیو

خبریں پہنچ رہی ہیں جو آمد کی بار بار
افواجِ روم و شام میں پیدا ہے انتشار
رستے سے آنکھیں لڑتی ہیں اُٹھتا ہے جب غبار
ہوتا ہے غل کہ آ گئے عباسِ نامدار

غالب ہراس رومیوں پر بھی غضب کا ہے
سکتے میں شکل آئینہ لشکر حلب کا ہے

ادھر فوجِ شام میں یہ تہلکہ برپا ہے۔ ادھر عباسِ غازی حضرت امام حسین

سے طالب رضا ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

باقی عزیز ہیں نہ رفیقانِ تشنہ کام　　اکبر فقط ہیں اور ہے یہ آپ کا غلام
فرمایئے حضور نہیں دیر کا مقام　　کون اب پئے گا رن میں شہادت کا جا کے جام
جرات میں کیا شجاعوں سے فائق نہیں ہوں میں
فرمایئے جدال کے لائق نہیں ہوں میں

گر میری موت آج نہیں کل بھی کیا ہے دور　　مجبور حکمِ حق سے ہے یہ بندہ غفور
تقدیر میں ہے موت اگر آج ہی ضرور　　تاخیر پھر ہے اذن میں کس واسطے حضور
واجب ادب ہے حجتِ حق کا امام کا
یارا نہیں غلام کو آگے کلام کا

حضرت امام مجبور ہو کر اذنِ جنگ عنایت فرماتے ہیں۔

یہ سُن کے شاد ہو گئے عباسِ باکرم　　سر کا یا پائے شاہ سے سر چوم کر قدم
کی عرض ہاتھ جوڑ کے پھر یوں بچشمِ نم　　زندہ رہیں حضور ہمیشہ بصد حشم
تا دورِ آسمان شہِ عرش آستاں رہے
نورِ خدا کے نور سے روشن جہاں رہے

اس کے بعد حضرت عباس خیمۂ ناموس میں داخل ہوئے

داخل ہوا حرم میں جب عباسِ باوفا　　دیکھا جدھر مرقعِ ماتم نظر پڑا
بیوہ بنی جو آئی نظر غم ہوا سوا　　پرسا بنے کا مادرِ نوشاہ کو دیا
رو کر کہا الم سے دل اندوہناک ہے
قاسم نہ ہوں جہاں میں تو جینے پہ خاک ہے

یہ دردآمیز گفتگو سن کر حضرت زینب نے

حیرت سے کی نظر سوئے عباسِ نامدار
فرمایا رو کے کیا ہیں یہ باتیں بہن نثار
کی عرض دست بستہ کہ اے آسمانِ وقار
اذنِ وغا کا آپ سے خادم ہے خواستگار
حسرت ہے یہ کہ گلشنِ جنت بساؤں میں
حکمِ حضور گر ہو تو مرنے کو جاؤں میں

سننا تھا یہ کہ دل میں ہوئی درد کی چمک
سمجھی کہ یہ بھی مرنے چلے کچھ نہیں ہے شک
پیدا جگر میں خارِ الم کی ہوئی کھٹک
بس قلب میں غضب کی اٹھی ہوک یک بیک
کیا ضبط ہو نہ دل کو جو پہلو میں کل پڑے
کانپا کلیجہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

بولیں کہ تیغ غم سے جگر چاک چاک ہے
کیا سخت مثلِ سنگ دلِ دردناک ہے
بھائی نہ ہو جہاں میں تو جینے پہ خاک ہے
بھائی بھی وہ کہ جس کی زمانے میں دھاک ہے
چھاتی پہاڑ مجھ سے کبھی کی نہ جائے گی
مرنے کی حشر تک بھی رضا دی نہ جائیگی

کی عرض رو کے تابع فرماں ہے یہ غلام
کیا تاب کیا مجال جو لوں اب وغا کا نام
لیکن یقین جانیئے اے آسماں مقام
جائیں گے جب کہ خلد کو شبیر تشنہ کام
دیکھیں گے سب کہ حلق سے خنجر گذر گیا
سن لیجیئے گا آپ کہ عباس مر گیا

یہ پرتاثیر بیان سن کر حضرت زینب تڑپ جاتی ہیں۔ اور فرماتی ہیں کہ اچھا اگر قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کہ عباس غازی بھی ہم سے جدا ہو جائیں

توہم مجبور ہیں۔ جاؤ خدا سرخرو کرے۔ اتنے میں تشنہ لب سکینہ وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ ناشاد بھتیجی چچا کو مسلح دیکھکر

بولی لپٹ کے قصد کہاں کا کیا بتاؤ — دریا کا قصد ہے تو مری مشک لیتے جاؤ
دم ہی لبوں پہ پیاس سے پانی مجھے پلاؤ — عباس پیار کر کے پکارے کہ مشک لاؤ

کیا کیا خطاب شہ سے ہمیں بے طلب ملے
تم مشک دو تو ہم کو بہشتی لقب ملے

حضرت سکینہ سے مشک لیکر اسے رایت سے باندھتے ہیں۔ اور سب سے مل کر خیمے کے باہر آتے ہیں۔ جہاں جناب امام اور حضرت علی اکبر آپکے منتظر کھڑے ہیں۔ اس وقت سقائے اہل بیت نے

تسلیم کر کے سرور دیں سے کیا کلام
آقا جو حکم دیں تو فرس پر چڑھے غلام

حضرت امام اجازت جنگ مرحمت فرماتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت علی اکبر سے یہ کہہ کر کہ برخوردار بابا سے ہر حال میں خبردار رہیو:۔

بڑھ کے ہوا وہ شیر جری رخش پر سوار — تن کر جو باگ لی تو بنا برق رہوار
یوں وہ سمند آگے بڑھا نعرہ مار کے — جس طرح شیر بیشے سے نکلے ڈکار کے

انداز بیان

رفتار وہ سبک جو رکھے پاؤں رہوار — سبزہ کو ایک شمہ خبر ہو نہ زینہار
قطرے عرق کے رخ سے ٹپکتے تھے بار بار — صحرا میں بن گیا تھا فرس ابر نو بہار

سب دنگ لشکر عمر ابن سعد تھا

چھل بل میں برق تھا تو گرجنے میں رعد تھا

حضرت عباس نے

روکا پہنچ کے متصل فوج راہوار　　نعرہ کیا کہ گونج اُٹھا دشت کارزار
کہنی تک آستیں کو چڑھا کر پھرا کیا　　فرمایا ہوشیار ہو اے قومِ نابکار
اب دیر کچھ نہیں ہے صفوں کی صفائی میں
دھارا بہے گا قلزم خوں کا ترائی میں

ہے خیریت اسی میں کہ روکو نہ میری راہ　　ہٹ جاؤ نہر سے کہ ہے پانی کی مجھکو چاہ
مشکل وگرنہ ہے مری شمشیر سے پناہ　　کر دے گی ایک ضرب میں تم سب کو یہ تباہ
عباس ہوں پسر میں خدا کے ولی کا ہوں
اے لشکرِ شغال اسد میں علی کا ہوں

یہ سن کے پھینکے اہلِ خطا نے کئی خدنگ　　جنبش میں آکے فوج بڑھی آگے بہر جنگ
چہرہ غضب سے ہو گیا صفدر کا لالہ رنگ　　جھک کر فرس کا کھینچ لیا شیر نر نے تنگ
ظاہر ہوئی جو ہیں سبقت فوج شام سے
صمصام لی دلیر نے تن کر نیام سے

تلوار کی تعریف

وہ تیغ جس طرف گئی سر کاٹنے لگی　　کشتوں سے ارضِ دشتِ وغا پاٹنے لگی
شاخِ نہالِ بغض و حسد چھانٹنے لگی　　پی پی کے خون زبان سی لب چاٹنے لگی
جس کے گلے سے مل گئی دم میں فنا ہوا
جوہر تھے یا کہ پانی میں سم تھا ملا ہوا

گرتی تھی کوند کوند کے شمشیر برق زا آفت تھی اِس طرف تو قیامت اُدھر بپا
یاں صف پہ صف گری تو پرے پر اُدھر پڑا بھاگا جو اس طرف سے وہ جا کر اُدھر گرا
تھا سر پہ سر کہیں تو کہیں تن پہ تن پڑا
کہتی تھی موت بھی کہ قیامت کا رن پڑا
حملہ کیا یمیں کی طرف گہ سوئے یسار گہ قلبِ فوج میں تھا دلِ شیر کردگار
بن کر گھٹا برستی تھی شمشیرِ آبدار بارش ادھر سروں کی لہو کی ادھر پھوار
دریائے خون دشت و غا میں بہا دیئے
شمشیرِ آبدار کے جوہر دکھا دیئے
آبِ شطِ فرات کے جو تھے نگاہبان بھاگے سب اس طرح کہ کسی کا نہ تھا نشان
پہنچے کنارِ نہر جو عباسِ نوجوان آنسو کے بدلے خون ہوا چشم سے روان
آئی جو پیاس یاد امامِ انام کی
حالت تباہ ہو گئی اس تشنہ کام کی
داخل ہوا فرات میں سقا بچشمِ نم لہریں بڑھیں کہ چوم لیں ہم جلد تر قدم
دریا میں تھا جو عکس رخ و پنجۂ علم دو بدر زیر آب چمکتے تھے دمبدم
وفادار گھوڑے کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ ؎
ابتر جو حال پیاس سے تھا رہوار کا
منہ مڑ کے دیکھنے لگا اپنے سوار کا
حضرت عباس نے گھوڑے سے جھک کر مشکِ سکینہ کو سیراب کیا
اور تشنہ لب باہر نکل آئے۔ لکھتے ہیں کہ :-

جس وقت نکلا نہر سے اسپ وفا شعار
سقے نے مشک دوش پہ رکھ لی بافتخار
چلایا فوج کو پسر سعد نابکار
لو مشک بھر کے لے چلا حیدر کا یادگار

بھاگے ہوؤں کو دوڑ کے جلدی پکار لو
دریا پہ گھیر کر اسد نر کو مار لو

حضرت عباس فوج کے نرغہ میں آجاتے ہیں اس وقت آپ نے

پوشیدہ کی ہے مشک سکینہ تہ سپر
کھاتے ہیں تن پہ تیر و سناں خنجر و تبر
نیزوں کے وار پہلو پہ کرتے ہیں خیرہ سر
سر سے قدم تلک ہے بدن سب لہو میں تر

آکر جراحتوں میں سنانیں جو گڑتی ہیں
چھینٹیں علم پہ خون کی اڑ اڑ کے پڑتی ہیں

لڑتے تھے اشقیا سے علمدار ذیوقار
آیا کمیں سے ایک ستمگار و نابکار
ماری شقی نے قہر کی شمشیر آبدار
ہیہات دست راست گرا کٹ کے ایکبار

صدمہ غضب کا دل پہ ہوا قلب پھٹ گیا
لڑتے تھے جس سے ہائے وہی ہاتھ کٹ گیا

دوسرا ہاتھ بھی کٹ جاتا ہے ساتھ ہی علم زمین پر گر پڑتا ہے۔ لکھتے ہیں

ٹھنڈا ہو علم تو کیا غم دلیر نے
دانتوں سے پکڑا مشک کے تسمے کو شیر نے

اس کے بعد مشک تیروں سے چھد جاتی ہے۔ اور سارا پانی بہ جاتا ہے
آخر کار آپ شہید ہو جاتے ہیں۔

جنابِ عارفؔ

گرداں ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا　　سیاح ہوں مدت سے میں صحرائے سخن کا
پروانہ ہے دل شمع تجلائے سخن کا　　مشتاق ہوں پھر دید سراپائے سخن کا

اس بدر سے حسن رخ مہتاب خجل ہے
اس بحر کا موجب مری بیتابئ دل ہے

دریائے سخن کے متعلق کہتے ہیں۔

اس قہر کا دریا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا　　پاس اُس کے کوئی بہرِ تماشا نہیں جاتا
گم راہ کوئی بھول کے رستہ نہیں جاتا　　ڈوبا کوئی بالفرض تو ابھرا نہیں جاتا

مطلب نہ کوئی کوشش و تدبیر سے نکلا
نکلا کوئی مر کھپ کے تو تقدیر سے نکلا

ڈرتے ہیں قدم رکھتے ہوئے اس میں شناور　　ہیبت ہے کہ دل کانپتے ہیں خوف سے تھر تھر
اُٹھتی ہے کبھی موج کبھی پڑتی ہی چادر　　نو مشق جو ہیں دیکھ کے ہو جاتے ہیں مضطر

لاتا نہیں خاطر میں سما اور سمک کو
ایک ایک حباب آنکھ دکھاتا ہے فلک کو

آب حیات سخن کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

رہتا ہے یہ آب اُن میں کہ جو ظرف ہیں عالی　　ہر رجس سے ہیں پاک کثافت سے ہیں خالی
حال اُسکی لطافت کا زمانے پہ ہی حالی　　لے لے کے حریص آتے ہیں کیوں جام سفالی

اس آب کی حرمت ہے ارباب نظر میں



حضرت عارف لکھنوی

رکھتے ہیں اُسے نشّہ صفت کاسۂ سر میں

شاعری کے لطیف عقدے کو سلجھانا ہر کسی کا کام نہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

واعقدہ یہ اندیشہ بد سے نہیں ہوتا کچھ نفع کبھی رشک و حسد سے نہیں ہوتا

جو امر کہ خالق کی مدد سے نہیں ہوتا کچھ اس کا ثمر کوشش و کد سے نہیں ہوتا

بے فضلِ خدا کیا ہوا محنت سے کسی کی

پھل سر میں آیا نہ ریاضت سے کسی کی

بس بحرِ طبیعت نہیں بہتر یہ روانی اونچا سر[1] اعدا سے ہوا جاتا ہے پانی

حق اپنا ہے شیریں سخنی رطب لسانی ہے نظم کہ ہیں سلکِ گہرِ بحرِ معانی

یہ نظم ہے یا دستۂ گل باندھے ہیں ہم نے

اس بحر میں مضمونوں کے پل باندھے ہیں ہم نے

اس تمہید کے بعد واقعاتِ کربلا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مرقوم ہے عاشورہ محرم کا یہ احوال جب ہوگیا گلزارِ حسن دشت میں پامال

لاشے کے اُٹھانے کو چلا فاطمہ کا لال ہمراہ ہوئے اکبر و عباس خوش اقبال

بے جاں جسد قاسمِ جرار کو پایا

ٹکڑے سمِ اسپاں سے تنِ زار کو پایا

آپ لاشۂ قاسم اٹھوا کر خیمۂ ناموس میں لے آتے ہیں۔ حرم میں کہرام بپا ہے۔ اس وقت

حضرت نے بھی خونِ جگر آنکھوں سے بہایا لے جا کے اُسے گنجِ شہیداں میں لٹایا

---

[1] پانی سر سے اونچا ہونا۔ معاملے کا حد سے گذر جانا۔

کچھ کہنے کا موقع جو علمدار نے پایا جلدی سے سر اپنا قدم شہ پہ جھکایا
کی عرض کہ مرنے کی رضا دیجئے مجھ کو
ہم شکل پیمبر پہ فدا کیجئے مجھ کو

کچھ کہنے نہ پائے تھے ابھی بھائی سے سرور اور سامنے خاموش کھڑے تھے علی اکبر
سوچے کہیں دیدیں نہ اجازت شہِ صفدر بس گر پڑے یہ بھی شہِ والا کے قدم پر
رو کر کہا بسمل ہے جگر شوقِ وغا سے
میداں کی اجازت مجھے ہو پہلے چچا سے

امام اس وقت عجیب کشمکش میں ہیں۔ دونوں حضرت کی آغوشِ مبارک میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ آپ حیران ہیں کہ کسے روکیں اور کسے اذنِ جنگ بخشیں۔

رشکِ گل تر ایک ہے اور رشک قمر ایک ہے پارۂ دل ایک تو ہے لختِ جگر ایک
دونوں پہ ہے شبیر کو شفقت کی نظر ایک اک بھائی برابر کا برابر کا پسر ایک
دونوں جگر و جان ولی ابنِ ولی ہیں
تصویر نبی وہ ہیں یہ تصویرِ علی ہیں

اصرار سے بھائی کے نہ تھا شہ کو جو چارا فرمایا نہیں دل کو مرے ضبط کا یارا
یہ داغ وہ ہیں کر سکے جو قلب گوارا ہے شاق بہت ہجر ہو اُن کا کہ تمہارا
صدمہ یہ دلِ زار و حزیں سہ نہیں سکتا
یہ امر وہ نازک ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

مگر جب حضرت عباس بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ تو حضرت علی اکبر

محترم چچا کے شوقِ وغا کو اپنے ارادے پر مقدم سمجھ کر خود اُن کی سفارش کرتے ہیں جناب امام مجبور ہو کر رخصتِ جنگ عنایت فرماتے ہیں۔

جنگاہ کی رخصت جو علمدار نے پائی گردن پئے تسلیم بصد عجز جھکائی
ہوتی ہے کٹھن بھائی کو بھائی کی جدائی صابر تھے مگر شاہ کو رقت بہت آئی

بیتاب ہوئے شدّتِ دردِ جگری سے
لپٹے شہِ دیں ہاتھوں کو پھیلا کے جری سے

حضرت عباس خیمۂ اہلِ بیت نبی میں داخل ہوتے ہیں۔ حضرت سکینہ آپ سے شکوہ کرتی ہیں سے

اب تک نہ دیا نہر سے اک جام بھی لا کے
اچھا مجھے اب پیار نہ کیجے گا بُلا کے

آغوش میں لیکر اُسے کہنے لگے عباس ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم کو ہے بہت پیاس
تھا صبح سے حضرت پہ ہجومِ الم و یاس مہلت نہ میسّر تھی کہ ہم بھی تھے انہیں پاس

تم مشک تو دو ہم ابھی منگواتے ہیں پانی
چاہا جو خدا نے تو ابھی لاتے ہیں پانی

حضرت سکینہ سے مشک لیتے ہیں۔ اور سب سے ملکر میدانِ جنگ کی طرف بڑھتے ہیں۔

گھوڑے کی تعریف

حاضر درِ دولت پہ جو تھا اسپ وفادار گردن پہ لکھ نامِ علی اور ہوئے اسوار
اُڑنے لگا جم جم کے جو میداں میں وہ رہوار شرما کے ہوا بھول گئی تیزی رفتار

کچھ برق سے بیتاب دمِ جلوہ گری ہے
اُڑنے میں ہر پارہ تو ٹھہرنے میں پری ہے
پیارا ہے وہ چہرہ کہ حسینوں کو بھی پیار آئے　　گلشن کی طرف یہ صفت ابر بہار آئے
کیا تاب قدم سے جو ذرا اُڑ کے غبار آئے　　بن جائے ابھی شیر جو نزدیک شکار آئے
انداز و ادا کبک دری سیکھ لے اس سے
اٹھلائی ہوئی چال پری سیکھ لے اس سے
پہنچے صفِ اعدا کے قریں جب کہ علمدار　　چمکار کے بس روک لیا گھوڑے کو اکبار
اللہ رے رعبِ خلفِ حیدرِ کرار　　سینوں میں جگر ہلنے لگے ڈر گئے اشرار
رنگ اڑ گیا پیدا ہوا رعشہ بدنوں میں
خوں سوکھ گیا شیر کی دہشت سے تنوں میں
تھے جمع یلانِ حبشؔ[1] و روم و رے و شام　　بد مذہب و نا اہل و سیاہ قلب و سیہ فام
حربہ وہ ہر اک پاس کہ جو موت کا پیغام　　فرمانے لگے دل میں یہ عباس خوش انجام
گو پیاس ہے پر لطفِ وغا آج ملے گا
بھاگے نہ اگر یہ تو مزا آج ملے گا
یوں سہم کے بولا پسرِ سعد جفا کار　　تدبیر یہی ہے کہ علم کیجئے تلوار
قبضہ پہ جو ڈالے ہوئے تھا ہاتھ کو جرار　　سننا تھا کہ بس کھینچ لی شمشیرِ شرربار
یوں میاں سے نکلی محل آیا جو برش کا
جس طرح کھنچے کلک سے مدِّ شین کشش کا

[1] حبش۔ ایک علاقے کا نام ہے یہاں کے باشندے بہت سیاہ فام ہوتے ہیں۔

تلوار کی تعریف

بجلی تھی کہ مسکن سے چمکتی ہوئی نکلی
کندن کی طرح صاف دمکتی ہوئی نکلی
ہر سو صفتِ شعلہ لپکتی ہوئی نکلی
آتش تھی کہ گلخن سے دہکتی ہوئی نکلی

کاٹھی کو جدا یوں کیا اس برقِ شیم سے
جس طرح کوئی کھینچ لے ریشہ کو قلم سے

اُٹھ کر صفتِ برق شرر بار گری وہ
مستانہ اداؤں پہ بھی ہشیار گری وہ
اس پار گری فوج کے اس پار گری وہ
سو بار اُٹھی دم میں تو سو بار گری وہ

یوں چار طرف تھر سے پھرنا نہیں آتا
بجلی کو بھی اس ڈھنگ سے گرنا نہیں آتا

یہ ڈھنگ شجاعوں کو ہیں مرغوبِ وغا کے
کہلاتے ہیں یہ طرزیہ اسلوبِ وغا کے
اب نام سے بھاگیں گے یہ مرغوبِ وغا کے
دکھلائے بہادر نے ہنر خوب وغا کے

وہ نخوت و پندار وہ عالم نہیں باقی
اب لشکرِ ظلم میں ذرا دم نہیں باقی

حملے کئے غازی نے یوہیں اور جو دو چار
میدان سے لشکر کے قدم اُٹھ گئے یکبار
بھاگے جو پیادوں کو کچلتے ہوئے اسوار
مقتل میں ہوئے زخمیوں کے اور بھی انبار

مجبور ہیں سب امن کا گوشہ نہیں ملتا
لاشوں کے یہ ہیں ڈھیر کہ رستہ نہیں ملتا

ل - قدم اُٹھ جانا - بھاگ پڑ جانا -

کہنے لگا پھر بڑھ کے ہر بر شہ والا دریا پہ چلا ہیں کوئی ہے روکنے والا
تھا زلزلہ ضرغام کی دہشت نے جو ڈالا اتنوں میں قدم ایک نے صف سے نہ نکالا
کی آنکھ بھی اونچی نہ کسی اہلِ حسد نے
میدان سے لی راہ ترائی کی اسد نے

پہنچے سرِ ساحل جو علمدار دلاور دریا پہ ٹہلنے لگے گھوڑے سے اتر کر
یہ دھیان جو آیا کہ ہیں پیاسے شہِ صفدر دم رک گیا اک چوٹ لگی قلبِ حزیں پر
بہہ بہہ کے رخِ پاک پہ آنے لگے آنسو
یاد آئی سکینہ تو بہانے لگے آنسو

کیا صبر تھا قربان علمدار وفادار مشکیزہ کو تر کر کے بھرا نہر سے ناچار
کہنے لگے پھر دل کی طرف دیکھ کے اک بار ہے شوق میں پانی کے تڑپنا ترا بیکار
کیا ہوگا اگر اور تعب پیاس سے ہوگا
یہ کام تو زنہار نہ عباس سے ہوگا

کہتے ہوئے یہ نہر سے باہر نکل آئے فوجوں کے ادھر سامنے سے دل پہ دل آئے
بے رحم سب آمادۂ جنگ و جدل آئے تیر آئے تو جانا کہ پیامِ اجل آئے
تیروں کو گذرتے ہوئے جب پاس سے دیکھا
عباس نے ایک ایک کا منہ یاس سے دیکھا

حضرت عباس جناب امام سے رن کی اجازت لیکر خیمۂ ناموس میں داخل ہوتے ہیں۔ اس وقت معصوم سکینہ سامنے آتی ہے۔ اور

برسا کے اشک آنکھوں سے مانند ابر تر
کرنے لگی چچا سے یہ باتیں وہ سیم بر
پیاسی ہوں کب سے میں نہیں یہ بھی تمہیں خبر
یہ مشک لے کے جائیے جلدی فرات پر
پیارا ب نہ کیجے آنکھوں کو میں کھولتی نہیں
بس جائیے حضور سے میں بولتی نہیں

آپ حضرت سکینہ کو یہ کہکر تسلّی دیتے ہیں کہ ے

رخصت ابھی ملی ہے شہ خوش صفات سے
بی بی کی مشک لاتے ہیں بھر کر فرات سے

اتنے میں آپ کی زوجۂ محترمہ موقعہ پر پہنچ جاتی ہیں۔ اور تیوروں سے آپکے دل کا حال معلوم کر کے کہتی ہیں۔

سمجھے ہوئے ہوں خوب مقدر کا اپنے حال
معلوم ہے جو آپ کا آنے سے ہے مآل
چہرہ سحر سے تو نہ تھا اس طرح سے بحال
بیشک امام پاک نے دی رخصت جدال
ہے مصلحت کوئی کہ جو مجھ سے چھپاتے ہیں
میں نے سنا ہے آپ بھی مرنے کو جاتے ہیں

اس غمزدہ سے سن کے یہ آفت کی داستان
بولے اک آہ کھینچ کے عباس نوجوان
ہاں اصل تو یہی ہے جو تم نے کیا بیان
آئے تھے تم جو کہنے وہ سب ہم پہ ہے عیان
گریہ نہ دمبدم صفت ابر چاہئے
زہرا کی ہو کنیز تمہیں صبر چاہئے

بیٹیوں کی سمت دیکھ کے پھر پیار سے کہا　　ضد کیجیو نہ ہو جیو ماں سے کبھی جدا
ہاں کھیلیو سکینہ سے شاباش مرحبا　　گرمیو نہ یاد کر کے ہمیں پیاس ہے ذرا
ماہر مری طرح ہیں تمہارے مزاج سے
تم اپنا باپ جانیو عابد کو آج سے

اُٹھے یہ کہہ کے حضرتِ عباس عرش جاہ　　تکیہ میں رہ گئی وہ حزیں بھر کے سرد آہ
زوجہ کی سمت یاس سے بھر کر کے اک نگاہ　　رخصت ہوا ہر ایک سے وہ آسماں پناہ
آہستہ سوئے درجو وہ شیرِ ژیاں چلا
غل تھا علی کے باغ کا سروِ رواں چلا

غازی کی سواری کے لئے سمندِ خوش رکاب حاضر ہوتا ہے لکھتے ہیں

آیا وہ رخش یوں کہ دلہن آئے جس طرح　　بادِ بہاری سوئے چمن آئے جس طرح
وہ چال ہے غزالِ ختن آئے جس طرح　　آہستہ یاں زباں پہ سخن آئے جس طرح

اس وقت

مرقع نگاری

آنکھوں کو مل کے پائے امامِ انام پر　　رکھا جری نے ہاتھ فرس کی لجام پر
لیکر خدا کا نام چڑھے خوش خرام پر　　بیٹھے سنبھل کے اب فرسِ تیز گام پر
سرعت سے اُسکے حالِ صبا غیر ہوگیا
فتراک سے جو یال ہلے طیر ہوگیا

اُڑ اُڑ کے بار بار اترتا ہوا اچلا　　جست آہوؤں کی طرح سے بھرتا ہوا اچلا
بشکلِ پری ادا سے سنورتا ہوا چلا۔　　اٹکھیلیاں نسیم سے کرتا ہوا چلا

طرز روش کو دیکھ کے مدہوش ہوگئی
چال اپنی خود ہوا کو فراموش ہوگئی

پہنچا علی کا شیر جو مابین فوج شام — اللہ رے رعب ہل گئے سینوں میں دل تمام
علموں نے جھک کے ہاتھ اٹھائے پئے سلام — نزدیک تھا کہ ڈر سے گریزاں ہوں خاص و عام
بڑھ کر تھی کچھ قضا سے بھی ہیبت دلیر کی
گھوڑے چراغ پا ہوئے بو پا کے شیر کی

حضرت عباس فوج شام سے معصوم بچوں کے لئے پانی طلب کرتے ہیں۔ مگر اس طرف سے صاف جواب ملتا ہے۔

تھرا گئے یہ سنتے ہی عباس نامور — غصہ میں آکے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کہنی تک آستیں کو الٹ کر بکر و فر — بس کھینچ لی نیام سے شمشیر شعلہ در
باہر وہ شعلہ بار ہوئی یوں نیام سے
ماہی تڑپ کے جیسے نکلتی ہے دام سے

ساقی نامہ

ساقی کدھر ہے ساغر مینا شتاب دے — گرمی سے جو نظر کی اُڑے وہ شراب دے
ہاں دیر سال کہنہ و پاکیزہ آب دے — بھر کر خم سپہر سے آج آفتاب دے
چل جائے دور بادۂ نصرت تو شام ہو
ڈھلنے نہ پائے دن کہ لڑائی تمام ہو

تلوار کی تعریف

سن سن ہوا کی طرح سے چلنے لگی نیام — برسا کے خون رنگ بدلنے لگی حسام

گر گر کے بار بار سنبھلنے لگی حسام　　زخموں کے پھول کھلتے ہی پھلنے لگی حسام
ڈھالوں کو آئی صورتِ خس کاٹتی ہوئی
اُتری گلوں سے تارِ نفس کاٹتی ہوئی

ڈھالوں کو دو کیا کبھی مغفر کئے دو نیم　　لہرا کے جب سروں پہ گری سر کئے دو نیم
چار آئینے کبھی بکتر کئے دو نیم　　اعضائے جسم نحس برابر کئے دو نیم
سکہ دلوں میں بیٹھ گیا اس ستیز کا
لوہا سپاہ مان گئی تیغِ تیز کا

جو رستم زماں تھے انہیں زال کر دیا　　لشکر کو ایک تیغ نے بیحال کر دیا
گر گر کے ایک برق نے رن لال کر دیا　　دریا کو ایک موج نے پامال کر دیا
ابرِ سیہ کے صاعقہ نے دل ہٹا دیئے
اک ماہِ نو نے موج کے بادل ہٹا دیئے

اس وقت عباسِ غازی شام کی بزدل سپاہ سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تم میں سے حوصلہ ہو کسی کو تو رن میں آئے　　دے دادِ جنگ[1] تیغ اٹھائے ہنر دکھائے
دن آج نام کا ہے لڑائی میں جی لڑائے[2]　　نامی جواں سنا کئے سب گردنیں جھکائے
دم بند خوف سے دمِ تقریر ہو گئے
ایسا ہوا سکوت کہ تصویر ہو گئے

---

[1] دادِ جنگ دینا۔ شجاعت کے کرتب دکھانا [2] جی لڑانا۔ جان توڑ کوشش کرنا۔

یہ سُن کر گھاٹ کے نگہبان مقابلے کے لئے بڑھتے ہیں۔ حضرت عباس بھی جوش میں آ گئے۔ لکھا ہے۔ کہ

جھنجھلا کے وار کرنے لگا بازوئے امام پیہم شکار کرنے لگا بازوئے امام
اک اک کو چار کرنے لگا بازوئے امام رن لالہ زار کرنے لگا بازوئے امام
بہتا ہے خون گرم جو ہر بد صفات کا
سب آگ ہوتا جاتا ہے پانی فرات کا

زور بیان

تھی مثل موج آب رواں تیغ آبدار دیتی نہ تھی کسی کو اماں تیغ آبدار
رگ رگ سے کھینچ لیتی تھی جاں تیغ آبدار تر کر رہی تھی خوں سے زباں تیغ آبدار
ڈوبی تھی خود لہو میں تلاطم میں فوج تھی
تلوار تھی کہ خون کے دریا کی موج تھی

بگڑی لڑائی کوئی بھی پہلو نہ بن پڑا الٹا بروئے خاک تھا ہر تیغ زن پڑا
دم توڑتا تھا ایک پہ ایک صف شکن پڑا لشکر میں حشر کیا کہ قیامت کا رن پڑا
زخمی جو بے شمار ہوئے بھیڑ چھٹ گئی
رن کی زمین خوں کے ڈریڑوں سے کٹ گئی

پا کر شکست بھاگ گئے جب وہ اہل شر آئے کنار نہر علمدار نامور
دیکھا جو سوئے آب تو تڑپے دل و جگر یاد آئی تشنگیٔ شہنشاہِ بحر و بر
موجوں کے اضطراب نے بیتاب کر دیا
ٹھنڈک نے آب سرد کی دل آب کر دیا

پیاسے تھے تین دن کے ہوا دل جو بیقرار نامِ سکینہ لے کے لگے رونے زار زار
دل سے کہا کہ دور بہت ہے وہ دل فگار پہنچائے کون اب اسے یہ آب خوشگوار
ممکن جہاں تلک ہو ہم اپنی سعی کد کریں
اس وقت آ کے ساقیٔ کوثر مدد کریں

محاکاتِ غم

آنسو بہا کے جانبِ مشکیزہ کی نظر دیکھا کہ خشک ہے نہیں پانی کا کچھ اثر
کہنے لگے یہ آہ حزیں دل سے کھینچ کر ایسا ہی خشک ہو گا سکینہ کا بھی جگر
مہمان ہو گی چند نفس کی جہان میں
کیا دور پڑ گئے ہوں جو کانٹے زبان میں
باتیں یہ کر کے دل سے بھرا مشک کو شتاب چشم جری کی طرح ہوئی مشک بھی پُر آب
دو اک قدم بڑھا تھا جگر بند بوتراب چلایا فوج کو عمر خانماں خراب
ہاں غازیو نہ ہات اُٹھانا لڑائی سے
دیکھو وہ منہ اسد نے نکالا ترائی سے

سپاہ شام چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ حضرت عباس ایک شدید مقابلے کے بعد شہید ہو جاتے ہیں۔

حضرتِ جاوید

رخصت طلب ہیں حضرت عباس ذی حشم　　لشکر پہ ہے نگاہ تو کاندھے پہ ہے علم
کہتے ہیں ہات جوڑ کے حضرت سے دمبدم　　قاسم کے بعد اب ہے مری زندگی بھی سم[۱]
جلدی رقم شہیدوں میں میرا بھی نام ہو
یہ آرزو ہے اب کہ تصدق غلام ہو

دیکھوں میں اور حضور کے بچے ہوں تشنہ کام　　میں آب آب[۲] ہوں کہ وہ لیتے ہیں میرا نام
ملجائے اذنِ جنگ کہ فیض آپکا ہے عام　　للہ جانے دیجے مجھے سوئے فوجِ شام
نکلا نہ کوئی کام تو کیا منہ دکھاؤں گا
پانی نہ گر ملا تو لہو میں نہاؤں گا

حاصل ہُوا جو اذن شہِ آسماں حشم　　آئے حضور گھر میں کہ مشتاق تھے حرم
روئی سکینہ دیکھ کے دل پہ ہُوا جو غم　　سمجھی کہ میری عمر کی مدت بھی اب ہے کم
فرمایا اس الم میں بھی شکر خدا کرو
جاتے ہیں ہم فرات پہ تم بھی دعا کرو

آنسو نہ تم بہاؤ کہ شق ہیں دل و جگر　　کیوں مضطرب ہو پیاسے ہیں خود شاہِ بحر و بر
مشکیزہ جلد لاؤ نہ گھبراؤ اس قدر　　چاہے گا وہ[۳] تو آئیں گے دم بھر میں ہم ادھر

---

۱ زندگی سم ہونا۔ زندگی تلخ ہونا۔ ۲ آب آب ہونا۔ شرم سے پانی پانی ہو جانا ۳ وہ۔ اشارہ ہے حضرت باری تعالیٰ کی طرف۔

افسوس آج جان کے لالے بھی پڑ گئے[1]
کانٹے تری زباں کے مرے دل میں گڑ گئے

مشکیزہ ایک لائی یہ سن کر وہ تشنہ لب — کی عرض مجھ میں پیاس کی طاقت نہیں ہے اب
آتے ہیں غش عطش سے یہ ہے روح پر تعب — اتنا مجھے بتائیے آپ آئیے گا کب
آئے گا مجھ کو چین نہ اک دم فراق میں
در پر کھڑی رہوں گی بڑے اشتیاق میں

گودی میں لے کے پیار سے عباس نے کہا — بی بی ہزار جان سے ہیں تجھ پہ ہوں فدا
ننھے سے ہات اٹھا کے خدا سے کرو دعا — ہو نہر پر جو دیر تو کیجو نہ کچھ گلا
مصروف ہو دعا میں کہ سختی ہے راہ میں
سونپا تمہیں خدا و نبی کی پناہ میں

سقائے حرم لشکر غنیم میں پہنچ جاتا ہے۔ اور معرکہ آرائی شروع ہوتی ہے آپ کی تلوار کے متعلق کہتے ہیں۔

وہ آبدار آگ لگاتی ہے ہر طرف — دریا لہو کے رن میں بہاتی ہے ہر طرف
سفاک ہے لہو میں نہاتی ہے ہر طرف — مل کر گلے صفوں کو سلاتی ہے ہر طرف
لوٹا متاع جاں کو عجب رہزنی کے ساتھ
ملتی ہے وہ گلے سے مگر دشمنی کے ساتھ

آئی جدھر صفوں کو برابر گرا گئی — ہر بزدلے کے ہاتھ سے خنجر گرا گئی
ریتی پہ روسیاہوں کے بکتر گرا گئی — جب سر اٹھا کے رن میں چلی سر گرا گئی

[1] جان کے لالے پڑنا۔ زندگی خطرہ میں پڑ جانا۔

فوجوں میں حشر کر دیا برپا جہاں چلی
برسی کبھی یہاں کبھی اٹھ کر وہاں چلی

ساقی نامہ

ہاں ساقیا خدا کے لئے اب شتاب دے — منہ چاند سا دکھا قدحِ آفتاب دے
یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ خالی جواب دے — جس میں ہو بوئے خونِ جگر وہ شراب دے
اُن کی تڑپ رُکے یہی امر محال ہے
بجلی بنی ہوئی ہیں رگوں کا یہ حال ہے

دے جلد جلد جام مئے خوشگوار کے — چُپ ہو گیا ہوں دیر سے تجھ کو پکار کے
اب ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں بادہ خوار کے — پھر مسکرا دے طاق سے شیشہ اتار کے

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔

برسوں کے بعد قلب کی حسرت نکال لوں — پردے میں جو چھپی ہو اُسے دیکھ بھال لوں
شیشوں کی گردنوں میں ذرا ہاتھ ڈال لوں — دل تو سنبھل ہی جائیگا ساغر سنبھال لوں
عازم فرات کا ہے خلف بوتراب کا
تو بھی بہا زمین پہ دریا شراب کا

پہنچے تھے کربلا میں جو سلطان نیک خو — خیمہ بپا ہوئے تھے ادھر کے کنار جو
معلوم ہے ہر اک کو ہوئی تھی جو گفتگو — اُس دن سے جوش[۱] کھا رہا تھا شیر کا لہو
پہنچے کہ اب ہلا دوں طبق اس زمین کے
قبضہ دکھا دوں نہر پہ دریا کو چھین کے

---

۱ لہو جوش کھا رہا تھا۔ یعنی لہو ابل رہا تھا۔ حالتِ غم و غصہ مراد ہے۔

گھاٹ کے نگہبانوں کو تہ تیغ کر کے نہر علقمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ مشکیزہ سیراب کر کے نہر سے باہر نکلتے ہیں۔ اور نرغۂ اعدا میں گھر جاتے ہیں۔ اس وقت یہ حالت تھی کہ :-

تلواریں راس و چپ سے لگاتے تھے بد شعار
مشکیزہ کو بچاتے تھے عباس نامدار
سب برچھیوں سے سینۂ اطہر ہوا فگار
چلتے تھے وار ایک کلیجہ پہ دس ہزار
اپنی تو جان کا نہ ذرا بھی ملال تھا
تھا بھی اگر تو مشک کا دل میں خیال تھا

ٹھہرے جو اک جگہ پہ علمدار نامدار
بازو پہ اک شقی نے کیا اک غضب کا وار
دیکھا ادھر کہ غم سے جگر ہو گیا فگار
یہ ہاتھ بھی جدا ہوا شانے سے ایکبار
دل سے کہا کہ تو نے کیا بھی تو کیا کیا
جب دونوں ہاتھ کٹ گئے شکر خدا کیا

ہٹتی نہ تھی دلیر کی گو مشک سے نگاہ
مارا کسی نے تاک کے اک نیزہ آہ آہ
پانی بہا جو مشک کا حالت ہوئی تباہ
گردوں کو دیکھنے لگے عباس عرش جاہ
یہ کوہِ غم گرا کہ بصد یاس گر پڑے
آخر زمیں پہ حضرت عباس گر پڑے

جناب رشید

عباس نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی
جنت کی سند فاطمہ کے ماہ سے چاہی
کونین کی دولت شہِ ذی جاہ سے چاہی
مشکل میں مدد جانِ یداللہ سے چاہی
چاہا کہ نثارِ پسرِ شیرِ خدا ہوں
پہلے علی اکبر سے شہِ دیں پہ فدا ہوں

تاثیرِ بیان

خاموش رہے دیر تک آقائے دوعالم
آنسو رخِ اقدس پہ بہے اور بڑھا غم
فرمانے لگے سر کو جھکا کر شہِ اکرم
کیا وقت ہے کس حال میں ہیں کس سے کہیں ہم
وہ لوگ کہاں ہیں جو کہا کرتے تھے ہم سے
مر کر بھی جدا ہونگے نہ حضرت کے قدم سے

ہم نے کسی عالم میں کسی کو نہیں چھوڑا
راحت ہوئی یا رنج کبھی منہ نہیں موڑا
جس امر کی ضد کی وہ کیا دل نہیں توڑا
پر اب غم و اندوہ سے دلؔ ہوگیا تھوڑا
جو قوتِ بازو ہیں وہی چھوڑ چلے ہیں
تھا جن سے قوی دل وہی دل توڑ چلے ہیں

حضرت عباس میں یہ درد آمیز اور پرتاثیر بیان سننے کی تاب کہاں تھی
آپ خوف و عجز سے تھرا اُٹھے اور عرض کی۔

ؔ دل تھوڑا ہو جانا۔ کمر ہمت ٹوٹ جانا۔

اے بحرِ کرم بہرِ امم اے شہِ جمہور　　　خادم قدمِ پاک سے ہوتا نہ کبھی دور
ہیں امر وہ درپیش کہ اسوقت ہوں مجبور　　　خوشنودیٔ حق دین کی تائید ہے منظور
اس بات سے خوش ہوتے ہیں ماں باپ بھی آقا
فرمائیں نہ اس بات میں عذر آپ بھی آقا

حضرت امام حسینؑ مجبور ہو کر بھائی کو اذنِ جنگ عنایت فرمائی
حضرت عباس فرسِ تیز قدم پر سوار ہو کر عازمِ دریا ہوئے۔ لکھتے ہیں:-

لی میان سے تلوار چلے جانبِ دریا　　　لشکر کو وہاں شمرِ ستمگر نے پکارا
پانی کے تردد میں ہے شبیرؑ کا سقا　　　جم جائیں صفیں روکے رہو نہر کا رستا
اس وقت پھرے منہ نہ لڑائی سے خبردار
شیر آتا ہے دریا کی ترائی[1] سے خبردار
یہ سنتے ہی اسوقت قریب آگیا لشکر　　　خشکی میں جو تھا سب لبِ دریا گیا لشکر
پھر گھاٹ پہ بادل کی طرح چھا گیا لشکر　　　پھر آئے جو یہ سامنے تھرا گیا لشکر

حضرت عباس نے ؎

بڑھ کر صفِ اول پہ کیا وار یکایک
سب فوج پہ چلنے لگی تلوار یکایک
شوکت وہ علمدار کی وہ شان علم کی　　　تلوار کی بجلی کبھی ٹھہری کبھی چمکی

---

[1] نشیب کی نمناک زمین۔

آواز بھی آتی نہیں گھوڑے کے قدم کی
پامال ہوئی جاتی ہے سب فوج ستم کی
ہے سرخ زمیں خون جو اعدا کا بہا ہے
وہ شیر کے نعرے ہیں کہ رن گونج رہا ہے

ہر وار میں گر گر کے لعینوں کا بھڑکنا
سب شامیوں پر تیغ کے شعلوں کا لپکنا
وہ زیرِ علم چہرۂ تاباں کا چمکنا
اُڑنا وہ پھریرے کا وہ پنجے کا لچکنا
تھا شور یہ ساعت بھی سدا یاد رہے گی
یہ شان یہ شوکت یہ وغا یاد رہے گی

آپ اور طرف آئے جو گھوڑے کو پلٹ کے
اکبار صفیں رہ گئیں دو چار الٹ کے
تیغیں جو سنبھالیں ستم ایجادوں نے ہٹ کے
غصے میں دلاور نے کیا وار پلٹ کے
گو بھاگ کے اپنوں کو بچاتے تھے ستمگر
یوں بڑھتے تھے پیچھے رہے جاتے تھے ستمگر

یہ بیت شاعر کے معتقدات ذاتی کی آئینہ دار ہے ؎

وا عقدۂ جاں کر دیا ہر ایک شقی کا
پھل تیغ کا ترشا ہوا ناخن ہے علی کا

تلوار کی تعریف

بھر بھر کے لہو میں ہوئی تیغ دو سر آتش
کرتی نہیں دریا کو مضرت مگر آتش
ہے شامیوں کا خون کہ ہے شعلہ ور آتش
اور بیچ میں پانی ادھر آتش اُدھر آتش
غصے کی حرارت ہے جو یہ حال ہوا ہے
ہے گرمیٔ رفتار کہ منہ لال ہوا ہے

گھوڑے کی تعریف

اس رخش کو عباس سا اسوار سنبھالے　　دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے
نرغے میں جہاں پہلوؤں سے ملگئے بھالے　　رہوار نے گویا پر پرواز نکالے
سب شامیوں سے بھر کے طرارہ نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارہ نکل آیا

پھر تلوار کا ذکر کرتے ہیں۔

جس دم وہ گری لاشوں سے رن پاٹ کے اٹھی　　فوجوں پہ جھکی یاں تو قریں گھاٹ کے اٹھی
منہ اور کھلا جب وہ لہو چاٹ کے اُٹھی　　سر کیا ہیں زمیں کا بھی طبق کاٹ کے اٹھی
غصہ ہے یہ سرخی ہے کہاں خونِ عدو کی
جوہر نظر آتا ہے ہر اک بوند لہو کی

وہ برق ہے جب رکتی نہیں ہوا چلتی ہے سن سے　　چنگاریاں تا چرخِ کہن جاتی ہیں رن سے
شعلہ کی طرح بھاپ نکلتی ہے بدن سے　　سوکھا ہوا اڑتا ہے لہو اُسکے بدن سے

حضرت عباس کی معرکہ آرائی کے متعلق کہتے ہیں۔

اب میان سے تیغوں کو نکلنے نہیں دیتے　　عاجز ہے کماں تیر کو چلنے نہیں دیتے
پہلو بھی پیادوں کو بدلنے نہیں دیتے　　گھوڑوں پہ سواروں کو سنبھلنے نہیں دیتے
لاکھوں کو دمِ تیغ زنی ٹوک رہے ہیں
بڑھتا ہے جو غصہ تو اُسے روک رہے ہیں

دیتے ہیں صدا فوج کو حال اب کہو کیا ہے　　سب لوگ کہاں ہیں کوئی صف سے نہ پرا ہے
افسوس نہ کچھ شرم ہے باقی نہ حیا ہے　　میدان سے تم ہٹ گئے مرجانے کی جا ہے

قبضے سے تڑائی گئی ضیغم کو نہ روکا
دریا کو تو روکا تھا مگر ہم کو نہ روکا
یہ کہتے تھے جو سامنے دریا نظر آیا گھوڑے کو اڑاتا ہوا وہ شیر نر آیا
دل دیکھ کے پانی کی روانی کو بھر آیا[1] پیاسوں کا خیال آگیا منہ کو جگر آیا
غازی نے جو دیکھا کہ کنارے پہ تری ہے
دھیان آیا کہ لب خشک سب اولادِ علیؑ ہے
سبزہ وہ لبِ نہر کا سردی وہ ہوا کی ارشاد کیا دل سے یہ قدرت ہے خدا کی

پانی ادھر اتنا کہ زمیں دشت کی تر ہے بے آب اُدھر ساقیٔ کوثر کا پسر ہے

دم لے کے بڑھے حضرتِ عباس دلاور رہوار کو ٹھہرا کے گئے نہر کے اندر
دریا سے بہت دور نظر آتا تھا لشکر دی پھر کے صدا مشک جو بھرنے لگے جھک کر
تم یہ نہ سمجھنا کہ پیے جاتے ہیں پانی
لو روکنے آؤ کہ لئے جاتے ہیں پانی
جب دوش پہ مشکیزہ دھرا آپ نے بھر کر اور پھیر کے گھوڑے کو چلے نہر سے باہر
دیکھا ہیں بہت دور خیامِ شہِ صفدر کی عرض مدد کیجیو اے خالقِ اکبر
عالم تھا خلاف ابنِ شہنشاہِ نجف سے
بھاگی ہوئی فوج آگئی پھر چار طرف سے

[1] دل بھر آنا۔ حالتِ رقت طاری ہونا۔

ہر سو سے چلے آتے ہیں سب اہلِ ستم پاس
لڑتے ہوئے میداں سے چلے آتے ہیں عباس
ہے خوف نہ کچھ جان کے جانے کا ہے وسواس
پانی کے پہنچنے سے مگر ہو گئی ہے یاس
نیزوں سے جو رہ اہلِ سقر روکے ہوئے ہیں
یہ مشک سکینہ پہ سپر روکے ہوئے ہیں

لڑتے لڑتے دونوں بازو شانوں سے علیحدہ ہو گئے تو :-

اس شیر نے دانتوں میں لیا مشک کا تسمہ
خون اتنا بہا زرد ہوا چاند سا چہرہ

سنبھلے جو ذرا جھک کے یہ نقشہ نظر آیا
اک تیرِ ستم چشمِ مبارک میں در آیا

مشکیزہ میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔ اور سارا پانی ضایع ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھکر آپ کی رہی سہی طاقت بھی پرواز کر جاتی ہے۔ گھوڑے سے نیچے گرتے وقت حضرت امام کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ ع

آقا یہ غلام آپ کا پامال نہ ہو جائے

سنتے ہی یہ دوڑے سوئے مقتل شہِ صفدر
ہمراہ چلے تھام کے بازو علی اکبر
خم تھی کمر اور بہ رہے تھے اشک برابر
جب چار قدم چلتے تھے گر پڑتے تھے سرور
اٹھا بھی نہ جاتا تھا شہِ عرش نشیں سے
اکبر جب اٹھاتے تھے تو اٹھتے تھے زمیں سے

صبحِ عاشور کے نمودار ہوتے ہی فوجِ شام ظلم پر مستعد ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

ناگاہ طبلِ جنگ بجانے لگے شریر　　　آئے پیامِ جنگ لئے اس طرف سے تیر
ساکت رہا مگر خلفِ شاہِ قلعہ گیر[1]　　　یہ رنگ دیکھکر ہوئے برہم جوان و پیر
سب ملتجی ہوئے شہِ گردوں جناب سے
کی عرض آکے یہ خلفِ بوتراب سے

تابِ مقاومت نہیں اب ہمکو زینہار　　　جو گھر میں آکے قتل کرے فوجِ نابکار
بہرِ خدا عطا ہو بس اب حکمِ کارزار　　　پھر شہ کے کام آئیں گے کسدن یہ جاں نثار
سر ہوں فدا قدم پہ اگر سرخرو اُٹھیں
توقیر ہے اسی میں کہ باآبرو اُٹھیں

سب سے پہلے انصار امام اذنِ جنگ لیکر میدان کارزار کیطرف بڑھتے ہیں اور یکے بعد دیگرے شہید ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حضرت حُر کی شہادت کا صدمہ برداشت کرنے کے بعد

قتلِ حبیب کا ہُوا شہ کو بہت ملال　　　پھر اور قتل ہو گئے اصحابِ خوشخصال
لڑنے کو آئے مسلمِ بیکس کے دونوں لال　　　پسپا ہوئیں صفیں وہ دلیرانہ کی جدال
حیدر کی آن بان تھے شیروں کے عزم میں
آخر شہید ہو گئے میدانِ رزم میں

---

[1] خلفِ شاہِ قلعہ گیر۔ حضرت امام حسین مراد ہیں۔

اب کون جنگ کیلئے جائے کوئی نہیں ‏ عباس نامدار ہیں یا اکبر حسین
اصرار پر یہ کہتے ہیں بھائی سے شاہ دیں ‏ بھیا تمہیں تو اذن نہ دے گا یہ دل حزیں

فرمایئے جو آپ چلے ہیں جدال کو
کس کے سپرد کرتے ہیں زہرا کے لال کو

یہ کہہ کے آبدیدہ ہوئے شاہِ نامدار ‏ شہ کے کلام پر ہوئے عباس بیقرار
پاسِ ادب سے چپ تھے مگر چشم اشکبار ‏ آخر کو ہات جوڑ کے کی عرض ایک بار

گو دھیان ہر طرح کے ہیں شاہِ انام کو
پر جس طرح ہو اذن ملے اب غلام کو

بخشی تھی حر کو آپ نے جب جنگ کی رضا ‏ بیتاب ہو کے رہ گیا خادم یہ آپ کا
مانع رہا مگر ادبِ شاہِ کربلا ‏ اب تو تمام کنبہ شہیدِ جفا ہوا

پھر عرض کرتے ہیں۔

ہے طالبِ نبرد ادھر فوجِ تندخو ‏ اب کون جائیگا صف لشکر کے روبرو
پاؤں جو اذن جنگ تو بڑھ جائے آبرو ‏ کچھ کچھ نکال لوں دل مضطر کی آرزو

اب آرزوئے زیست کریں کن کے واسطے
آخر غلام ہوتے ہیں کس دن کے واسطے

جناب امام مجبور ہو کر رضائے جنگ دیتے ہیں حضرت عباس خیمۂ اطہر میں آخری ملاقات کے لیئے آتے ہیں۔ حضرت سکینہ شدتِ تشنہ لبی سے بدحال ہے آپ دیکھ کر فرماتے ہیں۔

ان تیرے سوکھے ہونٹوں پہ قربان ہو چچا ‏ دو دن کی پیاس ہے تجھے اے میری مہ لقا

تو تشنہ لب ہے اور نہ عباس مرگیا
جاؤں گا نہر پر جو مددگار ہے خدا
اس وقت -

کہنے لگی لپٹ کے چچا سے وہ دل ملول
رن کو نہ جائیں آپ مجھے پیاس ہے قبول
اعدا سے جیس بیس میں ہو جائے کچھ نہ طول
آمادۂ جدال نہ ہو فرقۂ جہول
دل مانتا نہیں کہ جدائی ہو آپ سے
پانی کے واسطے نہ لڑائی ہو آپ سے

غازی نے پیار کرکے کہا تب بچشم نم
کیا تاب ہے جو جنگ کریں مجھ سے بدشیم
لے آؤ کوئی چھوٹی سی اک مشک اور علم
پانی ابھی تو لاتے ہیں دریا ہے دو قدم[1]
لے آئی مشک اور کہا بھر لائیے چچا
پر صدقے جاؤں جلد پلٹ آئیے چچا

زورِ بیان

آخر یہ شیر بیشۂ ضرغامِ دیں چلا
بپھرا کچھار کو اسدِ خشمگیں چلا
غازی پئے ستیز سوئے فوجِ کیں چلا
ابرو پہ بل الٹتا ہوا آستیں چلا
ہر سو ہوئی سپاہ میں شہرت دلیر کی
روباہ بھاگنے لگے ہیبت سے شیر کی

حضرت عباس کی خون آشام تلوار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

جس صف پہ آئی تیغ وہ صف بے نشاں ہوئی
جلتی زمیں پہ خون کی ندی رواں ہوئی

---

[1] دو قدم - بالکل قریب۔

ڈوبی جو سر میں زینِ فرس سے عیاں ہوئی
دل میں شگال راز نہفتہ نہاں ہوئی
چپکے سے گوشِ دل میں یہ کچھ آکے کہہ گئی
زخموں کے لب کو حسرتِ گویائی رہ گئی

رن سے گریز کرنے لگی فوج پُر دغل
غصہ میں نکلا شام کے لشکر سے ایک مل
کف منہ میں تیغ ہاتھ میں اور ابروؤں پہ بل
آتے ہی یہ دلیر کو ٹوکا کہ اب سنبھل
نازاں نہ اپنے دل میں ہو یوں دو کو مار کے
ہے میری ایک ضرب برابر ہزار کے

کیا ہے ارادہ آپ کے جانے کا نہر پر
جو مشک ساتھ لائے ہو نیزے میں باندھکر
پر اب تو میرے ہاتھ سے دشوار ہے مفر
بہتر ہے رکھ دو کھول کے تلوار اور سپر
کیا جانو تم ابھی ہنر کارزار کو
ممکن نہیں جو روک سکو میرے وار کو

غصہ میں یہ جواب علمدار نے دیا
لے جا یہ تیرا زعم ہے او بانیٔ جفا
لائی ہے تجھکو گھیر کے یاں خود تری قضا
ناآشنائے حق مجھے سمجھا ہے بے حیا
تنہا لڑیں ہزاروں سے ہم وہ دلیر ہیں
ہم شیرِ کردگار کے بیشے کے شیر ہیں

جھنجھلا گیا یہ گرم سخن سن کے زشت خو
غصہ سے کھولنے لگا سفاک کا لہو
گھوڑا بڑھا کے آیا غضنفر کے روبرو
بولی قضا کہ آگیا اب زد پہ کینہ جو
دعوے بڑے بڑے کئے پہلے غرور سے
اب وار کر رہا ہے مگر دور دور سے

اکبار نیزہ لے کے بڑھا جانب جری
غازی نے جھٹکا دے کے سناں اسکی چھین لی

پھر تیغ تیز لے کے بڑھا ظالم وشقی
بس ایک ہنھکٹی میں کلائی قلم ہوئی

منہ مڑ چکا تھا جنگ سے خانہ خراب کا
جو وار پڑ گیا خلفِ بوتراب کا

پیوند خاک ہو گیا جب وہ جفا پسند
عباس نے بڑھایا سوئے علقمہ سمند

بڑھ کر سپاہِ شام نے کی راہ نہر بند
پہنچے قریب نہر جو عباس ارجمند

چمکا علم جو فوج شہِ نامدار کا
سارا طلائی ہو گیا سبزہ کچھار کا

اندازِ بیان

ساحل کے آس پاس ہی جمعیت حباب
کرتا ہے منتشر انہیں موجوں کا اضطراب

سادات کی عطش سے جو دریا ہے آب آب
آب رواں کے چہرے پہ ہے گرد کی نقاب

مانند شیشہ دل غمدیدہ ٹوٹ کر
روئے حباب فرطِ ندامت سے پھوٹ کر

نہر میں داخل ہوتے ہی ؎

کہنی تک آستین چڑھا کر دلیر نے
مشکیزہ جھک کے بھر لیا پانی سے شیر نے

مشکیزہ بھر کے نہر سے نکلا وہ باوفا
جولاں کیا خیام کی جانب کو بادپا

بڑھ آئے چار سمت سے پھر بانئے جفا
جانے نہ پائے شیر یہ ہر سمت غل ہوا

سوئے خیام شہ نہ فرس کو بڑھانے پائے

پیاسوں تلک یہ مشک کو لے کے نہ جانے پائے

فوج غنیم چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور آپ کو شہید کر دیتی ہے۔

جنابِ کامل

جس وقت خاک میں چمنِ مرتضےٰ ملا سقائے اہل بیت کو اذن وغا ملا
حیدر کے لال کو گہر مدعا ملا رخصت ملی کہ خلعتِ راہ خدا ملا

نکلا جری اٹھا کے جو پردہ خیام کا
دھوکا ہوا سپہر کو ماہِ تمام کا

آیا ہزبر معرکہ رستخیز میں ہل چل پڑی نہیب سے اہل ستیز میں
ہیبت سے دم رہا نہ کسی تیغ تیز میں پیچھے ہٹے دلیر خیالِ گریز میں

گونجی جو دشتِ ظلم میں آواز شیر کی
روئیں تنوں پہ چھا گئی ہیبت دلیر کی

حضرت عباس رجز خوانی کرتے ہیں۔

ہم وہ ہیں جن کے واسطے پیدا جہاں ہوا گیتی ہوئی بسیط بلند آسماں ہوا

روز نبرد تیغ زنی ہے ہنر میرا ضیغم ہوں نیستانِ شجاعت ہے گھر میرا

حیدر کا لعل جب یہ رجز کر چکا بیاں　　　غازی نے لی میاں سے شمشیر جانستاں
نکلی چمک کے ابر سے اک برق ناگہاں　　　گویا ہلالِ عید ہوا چرخ پر عیاں
ادبار ابن سعد کا پیدا نشاں ہوا
فوجِ ستم کو قوس قزح کا گماں ہوا

قامت خمیدہ مثلِ کماں اس پہ سرفراز　　　حاضر جواب و تیز زبان و زباں دراز
باغِ جمال و گلشنِ حسن و نہالِ ناز　　　سرکوب و سر شگاف و سر انداز و حیلہ ساز
تلوار تھی کہ پرتوِ ابرو دلیر کا
شمشیر تھی کہ ناخنِ درّندہ شیر کا

تیغ دو دم کو تول کے وہ شیرِ نر بڑھا　　　گویا سحاب تیرہ کی جانب قمر بڑھا
طوبا صفت نشان شہ بحر و بر بڑھا　　　اقبال سر پہ کھول کے چترِ ظفر بڑھا
تھا صاف دبدبہ اسدِ کردگار کا
میداں سے شیر نر ہوا عازم کچھار کا

دیکھا جو ابن سعد سیہ کار نے یہ حال　　　یعنی کہ ہے فرات کا عازم علی کا لال
لشکر کیا روانۂ دریا باتّصال　　　آئے سمٹ کے نہر پر سب بانیٔ ضلال
حائل تمام فوج ہوئی رزمگاہ میں
لشکر پہاڑ بن گئے دریا کی راہ میں

غازی دھنسا سپاہ میں لیکر خدا کا نام　　　کوندی جو صاعقہ کی طرح شیر کی حسام
گھوڑوں سے یوں دہل کے گرے خود سرانِ شام　　　سمجھے یہ رہوار کہ ترکی[۱] ہوئی تمام

---

۱ ترکی تمام ہوئی۔ زور شور ختم ہو گیا۔

فوجوں کے ابر صورتِ قرطاس پھٹ گئے
ایسی ہوا چلی کہ رسالے الٹ گئے

تلوار کی تعریف

نیزوں کے بند کھول کے بیکار کر گئی　　ڈھالوں کے پھول توڑ کے مسمار کر گئی
بازو ہلا کے موت کو ہشیار کر گئی　　سوتے سلاتے فتنے کو بیدار کر گئی
دم میں ہزار رنگ کے جلوے دکھا گئی
اس غول پر برس گئی اُس کو جلا گئی

شوریدہ سر تھے دشت میں سرباز اک طرف　　تھے رن میں سہم گیں قدر انداز اک طرف
بھولے کھڑے تھے اسپ سبک تاز اک طرف　　راکب پڑے تھے خاک پہ ناساز اک طرف
تختہ کھلا ہوا تھا دوکانِ ثبات کا
بازار لٹ رہا تھا متاعِ حیات کا

یکتا جری کی تیغ تھی ہر ایک رنگ میں　　مانندِ صاعقہ جو اترتی تھی سنگ میں
راہیں نئی نکالی تھیں میدانِ جنگ میں　　راکب کے سر سے آتی تھی مرکب کے تنگ میں
مشتاق اختلاط تھی صدر و گلو کے ساتھ
ایک ایک رگ میں دوڑ رہی تھی لہو کے ساتھ

اللہ رے کاٹ صارمِ خارا شگاف کا　　سینہ ہزار چاک تھا دشتِ مصاف کا
دامن اٹھا کے زخمِ سپاہِ خلاف کا　　ہر بار پوچھتی تھی لہو روئے صاف کا
ہر چند غرق تھی ہمہ تن خونِ ناب میں
پیکر تھا خشک صورتِ آئینہ آب میں

تلوار تھی کہ ابر بقا صحرا میں ژالہ ریز   معمور تھا سروں سے کفِ وادیٔ ستیز
کیونکر یلانِ شام کو ملتی رہ گریز   وہ بزدل و ضعیف یہ جرار تند و تیز
بھاگیں تو وہ ہزار پہ کیا اختیار تھا
جاتے تھے جس طرف کو اجل کا حصار تھا

بیٹھا تھا در پہ خیمہ کے زہرا کا نونہال   اکبر کھڑے تھے باپ کے پہلو میں خستہ حال
ہم شکلِ مصطفےٰ سے یہ بولا علی کا لال   اس وقت کم ہے غلغلہ وادیٔ قتال
قرنا کی ہے نفیر یہ سندس کی دھوم ہے
لشکر کا شاید ابن علی پر ہجوم ہے

دیکھو تو دشتِ ظلم میں جا کر پدر نثار   کس مورچے پہ لڑتے ہیں عباس نامدار
یارب رہے صحیح و سلامت وہ شہسوار   شبیر ہو نہ منہ سے یتیموں کے شرمسار
فیروزمند خلق میں وہ مہ جبیں رہے
سرسبز باغِ حضرتِ ام البنین رہے

شبیر کے جواب میں بولا وہ لالہ فام   تشویش کی جگہ نہیں اے قبلۂ انام
آقا محل ہے شکر کا سجدہ کا ہے مقام   حیدر کے یادگار سے بھاگی سپاہِ شام
لشکر کو ابنِ سعد کے زیر و زبر کیا
مولا چچا نے معرکۂ جنگ سر کیا

حضرت نے جب سنا علی اکبر کا یہ کلام   سجدے میں بہر شکر جھکے قبلۂ انام
فضہ نے آکے یوسف شاہ کو دیا پیام   تم کو پھوپھی بلاتی ہیں اے میرے لالہ فام
دم ہے لبوں پہ آلِ رسالت پناہ کا

کہہ جاؤ گھر میں حال علمدار شاہ کا

آیا وہ رشکِ ماہ جو بنتِ علی کے پاس دیکھا کہ غش کے حال میں ہیں وہ خدا شناس
کی عرض دست بستہ کہ اے آسماں اساس اقبال کے حضور سے زائل ہوا ہراس
پسپا جری سے لشکرِ شمر و عمر ہوا
میداں میں فتحیاب علی کا پسر ہوا

یہ مژدۂ طرب جو پھوپھی سے کیا بیاں بنتِ علی کی جان میں جان آ گئی ناگہاں
سیدانیاں جو خوف سے بیٹھی تھیں نیم جاں کرنے لگیں سپاس خداوندِ انس و جاں
خوش حال اس نوید سے چھوٹے بڑے ہوئے
بچے پڑے تھے غش میں مگر اُٹھ کھڑے ہوئے

آیا قریبِ نہر جو وہ خاصۂ احد انگڑائی اک دلیر نے لی صورتِ اسد
گو تشنہ کام ہیں پسرِ ضیغمِ صمد پانی پہ کی نگاہ جری نے بچشمِ رد
اونچا کیا علم کے پھریرے کو شیر نے
دریا میں خوشخرام کو ڈالا دلیر نے

مشکیزہ کو سیراب کر کے تھوڑا سا پانی چُلّو میں لیتے ہیں۔

پانی کو لے کے ہاتھ میں وہ سایۂ الٰہ منہ کے قریب لا کے پیا چاہتا تھا آہ
یاد آ گئی جو تشنگیٔ شاہِ دیں پناہ پانی جری نے پھینک کے گردوں پہ کی نگاہ
آیا جو دھیان آلِ رسالت مآب کا
صدمے سے حال غیر ہوا اس جناب کا

اس وقت اپنے دل سے کیا اس طرح خطاب ناموسِ مصطفےٰ میں ہے دو دن سے قحطِ آب

عباس تو ہے راحتِ جانِ ابوتراب پانی اگر پیا تو کہیں گے یہ شیخ و شاب

دریا پہ آبرو کو دلاور نے کھو دیا

نامِ وفا کو ابنِ علی نے ڈبو دیا

پھر لی یہ کہ کے اسپ سبک سیر کی لگام ساحل کو آب جو سے پھرا شیر تشنہ کام

جب تک کہ مشک آب بھرے وہ فلک مقام پھر جمع ہو گئے تھے شریعہ پہ اہلِ شام

حائل تھی فوج راہ میں اس رشکِ ماہ کی

اُمڈی ہوئی تھی گھاٹ پہ ندی سپاہ کی

دیکھا کنارے پر جو یہ فوجوں کا اژدہام بیٹھا سنبھل کے پشتِ تگاور پہ تیز گام

گھوڑے کو چیرتا ہوا نکلا مہِ تمام رفتار تھی سمند کی یا کبک کا خرام

تلوار بے نظیر فرس لاجواب تھا

وہ برق شعلہ بار یہ تختِ سحاب تھا

ناگہ قریب فوج کے پہنچا وہ نامور گھوڑا ڈپٹ کے شیر بڑھا مثلِ شیر نر

آئی جو صاعقہ کی طرح تیغ ادھر ادھر کٹ کٹ کے دشتِ کیں میں گرے خود سروں کے سر

بارِ دگر جو لیلیٰ رنگیں ادا چلی

بجھنے لگے چراغ ہوائے فنا چلی

ناگہ کمیں سے چل گیا دشتِ میں پہ وا سنبھلا نہ تھا ابھی کہ جدا ہو گیا یسا

ناوک لگا جو سینے پہ غش کھا کے گر پڑا صدمے سے ضربِ گرز کے تیورا کے گر پڑا

رات کا وقت ہے دنیا پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے حضرت امام حسین انصار و اعزہ سے کہہ رہے ہیں۔

مخفی یہ ماجرا نہیں اے اہلِ اعتبار
آفت میں گھر گیا ہے محمد کا یادگار
دشمن ہیں میرے نام کے لاکھوں ستم شعار
لشکر کو اور آج کی شب کا ہے انتظار

ہوگی سحر کو فوج کشی رزم گاہ میں
غل اقتلوا الحسین کا ہوگا سپاہ میں

اس لئے بہتر ہے کہ تم تاریکی کی آڑ میں اس دشت بلا سے کہیں نکل جاؤ۔

اس دشت سے نکل کے تمہیں کوئی ڈر نہیں
جب میں نہیں تو راہ میں کوئی خطر نہیں

اصحاب نے سنا جو شہِ دیں سے یہ کلام
چہرے ہوئے وفورِ شجاعت سے سرخ فام
اُٹھے جناب حضرت عباس نیک نام
کی عرض دست بستہ کہ اے رہبرِ انام

جب تک جہاں میں دورۂ شمس و قمر رہے
دنیا میں برقرار شہِ بحر و بر رہے

وہ دن خدا نہ لائے زمانے میں یا امام
آقا کے بعد زندہ رہے خلق میں غلام
سائے کی طرح ساتھ رہیگا یہ تشنہ کام
جب تک بدن میں جان ہے اور ہاتھ میں حسام

ہمراہ ہوں رکاب امام غیور کے
نکلے گی جان اگر تو قدم پر حضور کے

انصار امام عرض کرتے ہیں۔

گھیرے کھڑا ہے چار طرف لشکرِ ستم
ہے عزت رسولِ خدا کا لبوں پہ دم

اس حال میں حضور کے ہم چھوڑ دیں قدم جائیں کریں عزیز امام زماں سے ہم

لیں راہ کربلا سے زمین حجاز کی

ایسا کبھی نہ ہوگا قسم بے نیاز کی

رات کی طویل گھڑیاں گذر جاتی ہیں۔ صبح شہادت نمودار ہوتی ہے

لشکر میں شاہ دیں کے موذن نے دی اذاں آمادۂ نماز ہوئے پیر اور جواں

پانی پئے وضو جو میسر نہ تھا وہاں دریا کی طرح اشک ہوئے آنکھ سے رواں

چہروں کو آبرو کیلئے شست و شو کیا

ابریق چشم تر سے سبھوں نے وضو کیا

ہمراہ ابن فاطمہ سب نے پڑھی نماز درگاہِ کبریا میں کئے سجدۂ نیاز

جب پڑھ چکا نبی کی زیارت شہِ حجاز آئے مصافحہ کو سب انصار سرفراز

بھیجا درود سب نے شہِ خوش صفات پہ

بوسہ دیا پھر ابن یداللہ کے ہات پہ

لشکر میں ابن سعد کے جاگے سپہ کار حاکم ہوا نفیر سے قرنا کی ہوشیار

چلتے پہن پہن کے مسلح ہوئے سوار لشکر ہوا روانہ میدانِ کارزار

رایت ہوئے بلند جنودِ ضلال کے

افسر بڑھے سپاہ سے گھوڑے نکال کے

دیکھا جو حر نے یہ سپہِ شام کا فساد رخصت ہوا امام زماں سے پئے جہاد

دی جا کے دشتِ ظلم میں مردانگی کی داد مارا گیا جدال میں جس دم وہ خوش نہاد

نکلا بریر معرکۂ کارزار میں

لڑ کر ہوا شہید رہ کردگار میں

پھر تو ہوئی یہ صورتِ میدانِ کارزار
رخصت ہوئے حسین کے اصحاب بار بار
آنے لگے رفیقوں کے لاشے قضائے کار
وہ بھی ہوئے جو خلد کو راہی بصد وقار
جلوے سبھوں کے لیلیٰ رخصت دکھا گئی
نوبت امامِ دیں کے یگانوں کی آ گئی

لٹنے لگے ریاضِ حسینی و حیدری
بجھنے لگے چراغ عقیلی و جعفری
باغِ محمدی میں ہوئی ایسی ابتری
اکبار خشک ہو گئیں شاخیں ہری بھری
ہمراہ شہ کے اکبر و عباس رہ گئے
دو شیرِ خشمناک فقط پاس رہ گئے

رخصت کے خواستگار ہوئے دونوں شیر نر
دیں کس کو اذنِ جنگ یہ بھائی ہے وہ پسر
وہ روشنی ہے آنکھ کی یہ قوتِ جگر
بالائے خاک بیٹھ گئے شاہِ بحر و بر
ایسا قلق ہوا شہِ عالی مقام کو
معلوم یہ ہوا کہ غش آیا امام کو

امامِ عالی جاہ اس کشمکش میں ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ایک نورِ نظر ہے۔ تو دوسرا قوتِ بازو۔ آخر بھائی کے ارادے کو مقدم جان کر اور حضرت زینب کی سفارش سے حضرت عباس کو اذنِ جنگ مرحمت فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد کرتے ہیں۔

واقف ہو تم کہ بند ہے دو تین دن سے آب
فرطِ عطش سے آلِ نبی کو ہے اضطراب
بھنتے ہیں تشنگی سے جگر صورتِ کباب
سوکھے پڑے ہیں گلبنِ بستانِ بوتراب

بچّوں کا حال پیاس سے ایسا تباہ ہے
مشکیزہ ہائے مشک پہ سب کی نگاہ ہے

یہ بات تم کو یاد رہے اے نکوسیر نہر فرات پر ہو تمہارا اگر گذر
مہلت بھی مشک بھرنے کی دیں تمکو بدگہر پانی ضرور لائیو بھائی کسی قدر
ہرچند اور رنج والم ہر طرف نہ ہوں
پانی اگر ملے تو یہ بچے تلف نہ ہوں

عباس نے سنا جو شہِ دیں سے یہ کلام پہلے ادب سے جھک کے جری نے کیا سلام
پھر عرض کی کہ اے شہِ دیں قبلۂ امام سقّائی حرم کو ہے موجود یہ غلام
گذرے ہیں تین دن مجھے پانی کے رنج میں
مرتا ہوں اُنکی تشنہ دہانی کے رنج میں

گھیرے ہوئے ہے گھاٹ کو ہر سمت سے سپاہ دریا پہ دس ہزار موکل ہیں روسیاہ
گو نہر کی ملے گی بڑی دقتوں سے راہ لیکن خدا کے فضل پہ فدوی کی ہے نگاہ
جاؤں گا تا بہ نہر لڑیں یا دغا کریں
بندے کے حق میں قبلۂ عالم دعا کریں

ناظم - لاہوری

تعریفِ سخن

شمشیرِ ہلالی خمِ ابروئے سخن ہے
تصویرِ سپر دائرۂ روئے سخن ہے
نیزہ الفِ قامتِ دلجوئے سخن ہے
تائیدِ خدا قوتِ بازوئے سخن ہے
مانوس ہے کس مرتبہ اللہ سخن سے
کونین میں جو کچھ ہے بنایا ہے وہ کُن سے

شاعر بچوں کی بیتابانہ حالت اور شدّتِ تشنہ لبی کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

بچّوں کی وہ بیتابیاں وہ پیاس کی شدت
وہ پانی کے پاٹے کی سسکتی ہوئی حسرت
بے چینی سکینہ کی رقیہ کی وہ رقّت
اصغر کا وہ سکرات وہ باقر کی نقاہت
تھامے ہوئے عباس ہیں مشک اور علم کو
سب بچے ہیں گھیرے ہوئے سقائے حرم کو

صغیر سن بچے حضرت عباس کے دامن سے لپٹے ہوئے ہیں اسے شاعر کہتا ہے۔

دامانِ علمدار ہے یا چرخ کا دامن
نادانوں کا جھرمٹ ہے کہ تاروں کا ہے خرمن

آنکھوں میں جو آنسو ہیں تو ہونٹوں پہ ہیں آہیں
عباس کی نظروں سے نہیں ہٹتی نگاہیں

حضرت عباس میدانِ جنگ میں چلتے وقت تشنہ لبانِ حرم کو دلاسہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

سقہ میں تمہارا ہوں شہِ دیں کا علمدار — بھر لاؤں گا مشکیزہ لڑائی ہو کہ تکرار
میں ایک ہی کافی ہوں اگر لاکھ ہیں اشرار — کرنا یہ دعا ہو نہ کہیں تیروں کی بوچھار
گر مشک سلامت رہی میں رک نہیں سکتا
یہ ہاتھ ہیں جب تک یہ علم جھک نہیں سکتا

حضرت زینب حضرت عباس کے لئے دعا مانگتی ہیں ؎

اللہ رکھے بھائیوں کا ساتھ سلامت
عباس دلاور کے رہیں ہاتھ سلامت
اس شان سے آئے صفِ اعدا کے مقابل — ہو قہرِ خدا جیسے گنہ گار پہ نازل
جب فوج سمٹتی ہوئی دیکھی سوئے ساحل — ہنس کر کہا یہ خام خیالی ہیں سے داخل
کس واسطے سب فوج یہ دریا پہ جھکی ہے
گرتی ہوئی بجلی کہیں خرمن سے رکی ہے
عباس مرا نام ہے اے فرقۂ گمراہ — تم سب سے زبردست ہے فرزندِ ید اللہ[1]
دریا سے خبردار کئے دیتا ہوں آگاہ — ساحل پہ گڑے گا علمِ فوجِ شہنشاہ
دیکھیں تو سہی روکنے کون آتا ہے ہمکو
اب لاکھ ہوں تو ایک ہے سقائے حرم کو

[1] حضرت عباس مراد ہیں۔

تلوار کی تعریف

تیر آئے اُدھر سے تو چلی تیغ ادھر سے | دل چھایا ملخ کا سا برسنے لگے پر سے
گرنے لگے جل جل کے خدنگ اسکے شرر سے | ہارے قدر انداز قضا اور قدر سے

تلوار کی تھی نوک کہ ہیرے کی کنی تھی
نیزوں میں نہ بوڑی نہ سنانوں میں انی تھی

خنجر جو علم کر کے بڑھا کوئی رسالا | چُندھیا گیا اس برق کا دیکھا جو اجالا
سر تن پہ نہ تھا ہاتھ جہاں باگ پہ ڈالا | میداں میں ہوئے راکب و مرکب تہ و بالا

گر گر کے جو یہ برقِ غضب کوند رہی تھی
خاکسترِ خرمن کو قضا روند رہی تھی

حضرت عباس گھوڑا دریا میں ڈال دیتے ہیں :-

مشکیزہ سکینہ کا بھرا دل کو سنبھالا | خود پیاسے رہے گھوڑے کو دریا سے نکالا
ساحل سے اکھاڑا علمِ سید والا | شمشیرِ شرر بار کو دیکھا کبھی بھالا

دریا سے رہِ خیمۂ شاہ دو جہاں لی
کاندھے پہ علم ہاتھ میں گھوڑے کی عناں لی

آیا جو ترائی میں سکینہ کا ہوا خواہ | بھاگا ہوا پھر جمع ہوا لشکرِ گمراہ
روباہوں سے پھر راہ رُکی شیر کی ناگاہ | گھمسان ہوا گھر گیا شیرِ اسد اللہ

اس کے بعد

اک ہاتھ ہوا جنگ میں غازی کا جو بیکار | لی دوسرے میں شیر نے شمشیرِ شرر بار
پیکار وہ کی جس سے عدو ہو گئے بیکار | تقدیر سے تدبیر مگر ہوتی ہے ناچار

اک آسرا تھا نذرِ ستم ہو گیا وہ بھی
جو ہاتھ سلامت تھا قلم ہو گیا وہ بھی

دانتوں میں غرض مشک کے تسمے کو دبا کر　　چھاتی کو سپر مشکِ سکینہ کی بنا کر
پٹڑی میں دبا کر علم اور سر کو جھکا کر　　چاہا کہ نکل جاؤں میں گھوڑے کو بھگا کر

تدبیر بنی کوئی نہ تقدیر حرم سے
رستہ نہ ملا جانے کا افواجِ ستم سے